سالکین کیلئے ایک گرانقدر تحفہ

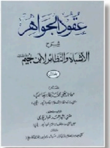
درجاتِ صدق

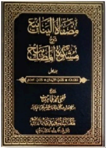
صدق کی حقیقت اور اس کے درجات کی تشریح
نصوص اور اکابر کے واقعات کی روشنی میں

از افادات
مفتی محمد طاہر صاحب
استاذ حدیث و مفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور
و خلیفہ مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب
مولانا محمد سلمان صاحب احیائی وانمباڑی

ناشر
مکتبہ سعیدیہ دار العلوم غازی آباد
رسول پور، سکروڈہ، غازی آباد، یوپی





نام کتاب: درجاتِ صدق، صدق کی حقیقت اور اس کے درجات کی تشریح نصوص اور اکابر کے واقعات کی روشنی میں

افادات: حضرت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب زید مجدہ

استاذ حدیث و مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، و خلیفہ حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

جامع و مرتب: مولانا محمد سلمان صاحب احیائی وانمباڑی

اشاعت: اکتوبر ۲۰۲۱ء مطابق ربیع الاول ۱۴۴۳ھ

تعداد: گیارہ سو (۱۱۰۰)

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ قاسمیہ مدرسہ احیاء العلوم، مدنی منزل، بشیر آباد، وانمباڑی، تمل ناڈو

موبائل:09894864520

(۲) مکتبہ سعیدیہ دار العلوم غازی آباد، رسول پور، سکروڈہ، غازی آباد یوپی

موبائل:08595480031

(۳) مکتبہ حکیم الامت، محلہ چوب فروشان، نزد مدرسہ مظاہر علوم وقف سہارنپور یوپی

موبائل:9759870037

(۴) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور، یوپی:

فون:1336-223294 موبائل:9756202118

فہرست

پیشِ لفظ

حضرت مولانا عطاء الرحمن صاحب دامت برکاتہم العالیہ
ناظم تعلیمات مدرسہ احیاء العلوم وانمباڑی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذي أكمل لنا الدين، وأتمَّ علينا النعمة، وجعل أمتنا خير أمة وبعث فينا رسولاً منا، يتلو علينا آياته ويزكينا ويعلمنا الكتاب والحكمة، وأشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له، وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، وصلى الله عليه وعلى آله وأصحابه صلوةً تكون لنا نوراً من كل ظلمة، وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

(۱) شریعت وطریقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے!

(۲) تزکیۂ نفس کے بغیر شریعت کی تفہیم وتکمیل بھی محال ہے!

(۳) اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں تزکیہ کا لفظ کتاب سے پہلے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران:۱۶۴)

(۴) جس طرح نماز میں طہارت مقدم ہے، جب تک نجاست سے پاکی حاصل نہیں ہو جاتی نماز کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا، اسی طرح باطنی ترقیات وفضائل کو حاصل کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اپنے دل کو رذائل سے پاک کیا جائے!

(۵) ساری آسمانی کتابوں کا مقصد اور تمام انبیاء کا مشترک اور اصولی پیام ”ہویٰ وہدیٰ“ کے دو لفظوں میں سمویا ہوا ہے ۔۔۔ اور یہی سارا اسلام ہے، اور اس میں ساری شریعت و طریقت سموئی ہوئی ہے۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَى﴾ (النازعات:۴۰،۴۱)

(٦) قرآن و سنت کی اصطلاح میں لفظ ”ہویٰ“ جو ”ہدیٰ“ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اس سے مراد ہوائے نفس ہے جو حظوظ (نفس کی وہ لذتیں جو ضرورتِ بقاءِ نفس اور ضرورتِ بقاءِ نسل سے زائد ہوں) کی قسم میں سے ہے! ۔۔۔ اسی سے بچنے کے لیے مجاہدات اور ریاضات کی ضرورت پیش آتی ہے!

(۷) دنیا میں جس کو بھی ہدایت کے سانچے میں ڈھل جانے کی دولت نصیب ہوئی ہے وہ مجاہدوں اور ریاضتوں ہی سے حاصل ہوئی ہے، صرف انبیاء علیہم السلام مستثنیٰ ہیں، ان کے کمالات کسب و اکتساب پر اور مجاہدہ و ریاضت پر مبنی نہیں ہوتے ۔۔۔ خاص عطاء حق و انعام باری تعالی ہوتے ہیں ۔۔، مگر عادۃ اللہ یہی رہی ہے کہ مجاہدات سے گذرنا ان کو بھی ہوتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (العنکبوت:٦٩)

(۸) جس وقت تک ظرف مصفّٰی و مشفّٰی نہیں ہو جاتا اس وقت تک اس میں جو بھی شئ داخل کی جائے گی وہ ناقص و ناتمام ہو کر رہے گی ۔۔ اور جب تک قلب ہوائے نفسانی سے پاک نہ ہو جائے اور خوف و خشیت، زہد و توکل وغیرہ پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک انسان قضاء و قدر کے فیصلوں پر ہرگز

مطمئن نہیں ہو سکتا۔

(۹) جس طرح علم دین کے حصول کے لیے علماء کرام کی راہنمائی ضروری ہے، اسی طرح تزکیۂ نفس کے لیے مشائخِ صالحین وصادقینِ عظام کی رہبری ناگزیر ہے!

(۱) اللہ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ مسلمانوں کا مجمع کسی زمانہ میں صادقین سے خالی نہیں رہے گا، اسی لیے حکم باری تعالیٰ ہے: ﴿كُونُوا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)، سچوں کے ساتھ رہو! اور صادقین گمراہی کا شکار نہیں ہوسکتے، اسی لیے ان کی معیت کا حکم ہے۔

(۱۱) ہاں یہ ضروری ہے کہ زمانہ ہر چیز کے، خصوصاً نیکی وخیر کے انحطاط اور تنزل کا ہے، خیر القرون میں خیر وصدق وصلاح کی کثرت تھی، ہر جگہ ہر گوشہ میں یہی جنس عام تھی، آج یہ جنس صلاح وصدق بہت تلاش سے ملتی ہے، اسی وجہ سے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے: «عليكم بمجالسة العلماء، واستماع كلام الحكماء، فإن الله يحيي القلب الميت بنور الحكمة كما يحيي الأرض الميتة بماء المطر» ۔ (مجمع الزوائد، کتاب العلم، باب فی فضل العلماء ومجالستہم)۔

(۱۲) دینِ اسلام دینِ دعوت وتبلیغ ہے، اسی لیے اللہ رب العزت نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ حق کا حکم دیا ہے، ارشادِ ربانی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾ (المائدۃ: ۶۷)، اور خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: «بلِّغوا عني ولو آية» (بخاری شریف:۳۴۶۱)، اسی لیے امت مسلمہ امت دعوت کہلاتی ہے۔

الحمد للہ! سلف وخلف میں بے شمار ایسی مقدس وپاکیزہ بزرگ ہستیاں گذری ہیں جنہوں نے دعوت و تبلیغ کے اس میدان میں کارہائے نمایاں سر انجام دیئے ہیں، انہیں عظیم المرتبت مقدس علماء میں سے ایک تابندہ شخصیت فقیہ الاسلام شارح مشکوٰۃ المصابیح مرشدی و مجبی حضرت مولانا مفتی محمد طاہر صاحب غازی آبادی دامت برکاتہم (خلیفہ فقیہ الامت حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، استاذ حدیث و مفتی مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور) کی ہے۔ آپ کا ذوق لطیف، طبیعت سادہ و نفیس، مزاج میں استقلال واعتدال، حق وباطل صواب وخطا کے درمیان امتیاز کرنے کی وافر صلاحیت، حقائق ومعارف میں یکتائے زمانہ۔ جنہیں قدرت کی فیاضوں نے علم وفضل کی بیکرانیوں کے ساتھ ساتھ زبان وبیان کی حلاوت ولطافت سے بھی بطور خاص نوازا ہے۔ چنانچہ فقیہ الاسلام کا ہر درس وتقریر، تحریر، علمی نکات ولطائف سے لبریز ہوتی ہے، اور آیاتِ قرآنیہ واحادیثِ نبویہ کے رازہائے سربستہ سے اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک بحر ذخار موجزن ہے علم وفن کا۔

بظاہر تقریر میں نہ جوش وخروش، نہ پر تکلف اندازِ بیان اور نہ خطیبانہ ادائیں، مگر خطاب اس قدر موثر اور مسحور کن، علم وحکمت سے لبریز، لاجواب وبے مثال، مرتب اور تعلیم یافتہ طبقہ کے درمیان مخصوص افہام وتفہیم اور حکیمانہ اسلوب، کہ سامعین سراپا گوش بن جاتے ہیں، عوام بہت دلچسپی اور شوق سے سنتے ہیں، اور اہل علم عش عش کرتے ہیں، اس طرح ہر خاص وعام میں مقبول ہیں۔

چنانچہ انہیں گراں قدر ملفوظات کا ایک مجموعہ بعنوان **"درجاتِ صدق،**

صدق کی حقیقت اور اس کے درجات کی تشریح نصوص اور اکابر کے واقعات کی روشنی میں" ہدیہ ناظرین کیا جارہا ہے، جس کو عزیزم مولوی محمد سلمان وانمباڑی نے مرتب کیا (اللہ تعالیٰ موصوف کی محنت کو قبول فرمائے) اور حضرت دامت برکاتہم کے علم و فضل اور عمر و صحت میں برکت عطا فرمائے، اور ہم تمام کو حضرت دامت برکاتہم کے ملفوظات سے مستفیض ہونے کی توفیق عنایت فرمائے! آمین بجاہ سید المرسلین۔

(حضرت مولانا) عطاء الرحمن غفرلہ
(ناظم تعلیمات مدرسہ احیاء العلوم، وانمباڑی)

تقریظ

حضرت مفتی سبیل احمد صاحب قاسمی دامت برکاتہم

خلیفہ فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ وصدر جمعیۃ علماء تملناڈو

نحمده ونصلي على رسوله الكريم، أما بعد!

"درجاتِ صدق، صدق کی حقیقت اور اس کے درجات کی تشریح نصوص اور اکابر کے واقعات کی روشنی میں" جو انتہائی قیمتی مجالس میں کیے گئے مواعظِ حسنہ ہیں، جس کو جمع اور مرتب کیا ہے عزیزم مولوی محمد سلمان صاحب احیائی وانمباڑی نے، یہ مواعظ در اصل نمونۂ اسلاف شیخ طریقت استاذ العلماء حضرت مفتی محمد طاہر صاحب دامت برکاتہم (خلیفہ ومجاز فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ، وصدر مفتی جامعہ مظاہر علوم سہارنپور) نے ۱۴۴۰ھ کے ماہِ رمضان المبارک میں علماء کرام کے لیے خصوصی مجالس میں فرمائے تھے، بندہ نے از اول تا آخر مکمل بالاستیعاب مطالعہ کیا، بہت ہی قیمتی مواعظ ہیں، یہ یقین ہوا کہ تقوی واخلاص کی بناء پر، بلکہ تقوی کے حصول کے لیے جن درجات کا ان مواعظ میں امیر المؤمنین فی الحدیث عارف باللہ حضرت مولانا شیخ محمد یونس صاحب رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ کی نصائح کی تشریح فرماتے ہوئے حضرت مفتی صاحب زید مجدہم العالی نے پورے مالہ وما علیہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، یہ محض خود حضرت مفتی صاحب زید مجدہم کو اللہ تعالی نے ان درجاتِ صدق سے متصف فرمایا ہے، اس کی برکات ہیں، بروقت مواعظ اتنے جامع، مرتب، مفید، علمی نکات پر

مشتمل یہ صرف اور صرف تقوی کے اور درجاتِ صدق کے برکات ہیں، بندہ کا یہ ماننا ہے کہ ہر عالم کو ضرور ان مواعظ کو بالالتزام مطالعہ کرنا چاہئے۔

اللہ تعالی حضرت مفتی صاحب زید مجدہم کو اپنی شایانِ شان جزائے خیر عطا فرمائے، یقیناً آپ جمیع علماء کرام کی طرف سے جزائے خیر کے مستحق ہیں، علم، عمل، عمر، صحت وعافیت میں خوب از خوب برکت عطا فرمائے!

بندہ کو یک گونہ خصوصی طور پر مسرت ہورہی ہے کہ یہ سب فیضِ اکابر ہمارے حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ کا ہے، جن کو تھوڑی دیر کے لیے حضرتؒ کی صحبت ملی ہو وہ ضرور اس کو محسوس کریں گے، اللہ تعالی حضرتؒ اور دیگر اکابرین رحمہم اللہ تعالی اجمعین کے درجات کو بلند فرمائے!

عزیزم مولوی محمد سلمان صاحب کو اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے! اور اس طرح کے کاموں کی توفیق مرحمت فرمائے! ان مواعظِ حسنہ کو قبول فرمائے! آمین بجاه سيد الإسراء والمرسلين وخاتم النبيين، صلى الله تعالى عليه وآله وصحبه وسلم۔ والسلام۔

احقر **سبیل احمد** غفرلہ

یکے از خدام حضرت فقیہ الامتؒ

۵/ ذی الحجہ الحرام ۱۴۴۱ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مجلس (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ اَمَّا بَعْدُ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

مقصدِ مجلس:

بزرگانِ محترم: ہماری یہ مجلس بیان اور وعظ کے لئے نہیں، بلکہ مذاکرہ کے لئے ہے، آپ حضرات اہلِ علم ہیں، اہلِ دانست ہیں، اِس لئے آپ کو نصیحت کرنا مقصود نہیں بلکہ جو کچھ آپ کے اور ہمارے ناقص علم میں ہے، اُس کا مذاکرہ اور تکرار مقصود ہے، احقر اہلِ علم سے خطاب کو مذاکرہ ہی کا عنوان دیتا ہے، کیونکہ یہاں مخاطب علماء ہیں، اُن کے ساتھ جو مجلس ہوتی ہے، وہ معلومات کے مذاکرہ اور یاددہانی کے مقصد سے ہوتی ہے، جیسے طلبہ استاذ سے پڑھے ہوئے سبق کا باہم تکرار و مذاکرہ کرتے ہیں، اِس سے پڑھا ہوا سبق ذہن نشین ہوجاتا ہے، اور قلب میں راسخ ہوجاتا ہے، علماء کی مجلس میں احقر اِسی نیت سے گفتگو کرتا ہے۔

صادقین کی صحبت میں رہنے کا حکم:

برادرانِ عزیز: جو آیت میں نے خطبہ میں پڑھی، اُس میں حق تعالیٰ شانہ

نے اہلِ ایمان کو دو حکم دئے، ایک یہ کہ اللہ کے لئے تقویٰ اختیار کرو، دوسرے یہ کہ صادقین (سچے لوگوں) کی صحبت کو اختیار کرو۔

صادقین کی معیت کا حکم کیوں دیا گیا:

صادقین اللہ کے برگزیدہ اور مقبول بندے ہوتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ وفاداری اور اطاعت شعاری کی وجہ سے باری تعالیٰ کا، اُن پر خاص فضل ہوتا ہے، اور وہ انعاماتِ الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں، اللہ کا پاک ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء:۶۹)

"اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اُس کے رسول کا، سو وہ اُن کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا، یعنی نبی اور صدیق اور نیک لوگوں کے ساتھ، اور اچھی ہے اُن کی رفاقت"۔

اِس آیت کی صراحت کے مطابق جن خاصانِ خدا پر خصوصی نعمتوں کا فیضان ہوتا ہے، وہ اُس کے چار قسم کے بندے ہیں: انبیاء علیہم السلام، صدیقین، شہداء، اور صالحین۔

صدیقین دوسرے نمبر پر ہیں (صدیق صادق کے ہی ہم معنی ہے، البتہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے) یعنی جو لوگ اُن کی صحبت اختیار کریں گے، اُن پر بھی خدا کی نعمتوں کی بارش ہوگی، یہ حضرات اللہ کے بافیض بندے ہیں، اِن کا نفع اِن کی ذات تک محدود نہیں ہوتا، اِن کے اندر اللہ نے ایسی قوتِ قلبی پیدا فرمادی کہ وہ دوسروں کو فیض پہنچانے کے قابل ہو گئے، اِس لئے حق تعالیٰ نے اِن کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا، جو شخص اِن کی معیت میں رہے گا، وہ اِن کے فیض سے فیضیاب ہوگا۔

صدق کا دنیوی واخروی فائدہ:

صدق کا دنیا میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ سچا شخص لوگوں کی نظر میں باعزت ہوتا ہے، اپنے اور پرائے سب اُس سے محبت کرتے ہیں، چنانچہ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:

«عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرّٰى الصِّدْقَ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيْقاً»۔ (مشکوۃ شریف ج۲ ص۴۱۲)

روایت کا حاصل یہ ہے کہ تم صدق کو لازم پکڑو، کیونکہ صدق انسان کو نیکی کی طرف لے جاتا ہے، اور انسان سچ بولتا ہے، اور ہمیشہ صدق کا اہتمام کرتا ہے، تو اللہ کے یہاں اُس کو صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔

امام نووی نے اِس کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ حق تعالیٰ شانہ مخلوق کے لئے بھی اپنے اُس بندے کی اِس صفت کو منکشف فرمادیتا ہے، اور لوگوں کے قلوب میں اُس کی محبت اور قبولیت پیدا فرمادیتا ہے۔ (مرقاۃ ج۹ ص۱۳۰)

آخرت میں بھی صدق کا بڑا نفع ہے اور اُس پر بڑا اجر بیان کیا گیا ہے، اللہ کا پاک ارشاد ہے:

﴿لِيَجْزِيَ اللهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ﴾ (الاحزاب:۲۴)

یعنی روزِ قیامت حق تعالیٰ شانہ صادقین کو اُن کے صدق کا (بڑا) اجر عطا کریگا۔

دوسری آیت میں ہے:

﴿يَوْمَ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ﴾ الخ (المائدہ:۱۱۹)

یعنی اُس دن صادقین کو اُن کا صدق، بڑا نفع پہنچائے گا، وہاں کے شدائد

اور مشکلات سے صدق کی برکت سے نجات حاصل ہو گی۔

شیخ یونس جونپوریؒ کے بیان فرمودہ صدق کے درجات:

صادقین کی صفات کیا ہیں؟ صادقین کی فہرست میں آدمی کب داخل ہوتا ہے؟ لفظِ صادق ایمان والے پر کب صادق آتا ہے؟

اِس بارے میں ہمارے شیخ یونس صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور صدق کے چار درجے واقسام بیان فرمایا کرتے تھے: (۱) صدق فی الجَنان (۲) صدق فی اللسان، اِس کی دوسری تعبیر ہے: صدق فی المقال (۳) صدق فی الافعال (۴) صدق فی الاحوال۔

صدق کے یہ چار درجے واقسام حضرت نے اِجمالاً بیان فرمائے، اِس کی تشریح وتفسیر بندۂ ناچیز نے حضرت سے نہیں سنی، حضرت اب دنیا میں بھی نہیں رہے، احقر نے حضرت کی روح کو ایصالِ ثواب کیا، اور اللہ سے دعا کی کہ اُن کی برکت سے کچھ تشریحی امور ذہن میں ڈالدے، چنانچہ اِس سلسلے میں جو کچھ بندۂ ناچیز کے ذہن میں آیا، اِن مجالس میں اُسی کو بیان کرنے کا ارادہ ہے۔

صدق کے معنی اور صدق فی الجَنان کا مفہوم:

شیخ یونس صاحبؒ کے حوالہ سے صدق کے چار درجے واقسام بتائے گئے، اِن درجات واقسام کی تفصیل کے لئے پہلے صدق کے معنی سمجھنے چاہئیں۔

صدق کے معنی سچائی اور مطابقتِ واقعہ کے ہیں، یعنی ایک شئ کی دوسری شئ کی طرف جو نسبت ہو، وہ مبنی بر حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہو، اور جَنان کے معنی قلب کے ہیں، قلب کی صداقت کا مطلب یہ ہے کہ جو افعال قلب سے تعلق رکھتے ہیں وہ نفس الامر اور واقعہ کے مطابق ہوں۔

مراد یہ ہے کہ شرعی تعلیمات کے مطابق ہوں، کیونکہ شرعی تعلیمات ہی نفس الامر اور واقعہ کے مطابق ہیں، اسی لئے ان کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

افعالِ قلب کی اقسام :

اور افعالِ قلب دو قسم کے ہیں: ایک وہ افعال جو از قبیلِ عقائد ہیں، مثلاً توحید ورسالت کا عقیدہ رکھنا، آخرت کو ماننا وغیرہ تمام عقائدِ حقہ۔

پس جس شخص نے اللہ کی وحدانیت اور نبی کی رسالت کا عقیدہ رکھا اس کا قلب سچا ہے، کیونکہ اس نے امر واقعی کا عقیدہ رکھا، قرآن کریم میں اس عقیدہ کے حامل لوگوں کو ''صدیقین'' کہا ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ﴾ (الحدید:۱۹)

یعنی جولوگ ایمان لائے اللہ پر ،اور اُس کے رسولوں پر، وہی لوگ سچے ہیں۔

دوسرے وہ افعال جو از قبیلِ اخلاق ہیں، مثلاً تواضع، شکر، صبر، توکل، تحمل، حسنِ ظن خوف ورجاء وغیرہ۔

صداقتِ قلب کا لازمی ثمرہ: حسنِ ظن وخیر خواہی:

پھر اِن میں بھی درجات اور مراتب ہیں، جن اخلاق کا تعلق دوسرے انسانوں سے ہے، یعنی جن اخلاق کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب اللہ کی مخلوق سے سابقہ پڑتا ہے، اُن کے حقوق العباد میں سے ہونے کی وجہ سے اُن کی اہمیت زیادہ ہے، ایسے اخلاق میں ''حسنِ ظن ''سرِ فہرست ہے، چنانچہ اللہ کی مخلوق بالخصوص مسلمانوں کے بارے میں نیک گمان رکھنا بھی قلب کا صدق

ہے، کیونکہ بمقتضائے حدیث: بدگمانی اکثر غلط اور خلاف واقعہ ہوتی ہے، اِسی لئے ایک حدیث میں کسی کے بارے میں براگمان رکھنے سے منع کیا گیا ہے:

«اِیَّاکُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَکْذَبُ الْحَدِیْثِ» (بخاری ج۲ص ۷۷۲)

کہ تم (برے) گمان سے بچو، کیونکہ گمان جھوٹی بات ہے۔

مذکورہ معنی کے لحاظ سے جو شخص صدقِ قلب کی صفت سے متصف ہوتا ہے، وہ ایک طرف ایمان وعقیدہ کا اِس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ اُس کو اپنی جان دینا گوارا ہو جائے گا، لیکن اپنے عقائدِ حقہ سے سرِ موانحراف گوارا نہ ہو گا۔

دوسری طرف غلبہ حسنِ ظن کی وجہ سے اللہ کی مخلوق کے حق میں اُس کی سوچ مثبت ہو جاتی ہے، وہ خلقِ خدا کے لیے فائدہ اور نفع کی باتیں سوچتا ہے، ٹیڑھی اور نقصان کی باتیں کسی کے لئے نہیں سوچتا، اُس کے قلب میں مخلوق کی خیر خواہی راسخ ہو جاتی ہے، پھر وہ اپنی تمام جدوجہد لوگوں کی نفع رسانی اور خیر خواہی کے لیے کرتا ہے۔

وساوس معاف ہیں:

البتہ خیال اور وسوسہ غیر اختیاری چیز ہے، خیال اچھا بھی آتا ہے اور برا بھی آتا ہے، اِسی طرح نفس وشیطان کے تصرف سے وسوسہ بھی آسکتا ہے، لیکن خیال اور وسوسہ کو اللہ نے معاف فرمایا ہے، اُس پر مؤاخذہ نہیں ہے، لہٰذا یہاں خیال اور وسوسہ سے بحث نہیں، کیونکہ وہ غیر اختیاری امر ہے۔

تین خصلتیں قلب میں صداقت پیدا ہونے کا سبب:

ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جس مسلمان کے

اندر تین خصلتیں ہوں، اُس کا قلب خائن نہیں ہو گا، اُن میں سے ایک خصلت ہے: «اَلنَّصِيحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ» یعنی مسلمانوں کے تئیں خیر خواہی کا جذبہ۔

دوسری چیز عمل میں اخلاص، اور تیسری چیز عمل اور عقیدہ میں جماعتِ مسلمین کے ساتھ رہنا، اُن سے علیحدہ نہ ہونا، حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں:

«ثَلٰثٌ لَا يَغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ مُسْلِمٍ، اِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلّٰهِ، وَالنَّصِيحَةُ لِلْمُسْلِمِيْنَ، وَلُزُوْمُ جَمَاعَتِهِمْ، فَاِنَّ دَعْوَتَهُمْ تُحِيْطُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ»

(مشکوۃ، کتاب العلم، فصلِ ثانی ص ۳۵)

یعنی تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں کسی مسلمان کا دل خیانت نہیں کرے گا: اللہ کے لئے عمل میں اخلاص، اور مسلمانوں کے تئیں خیر خواہی، اور جماعتِ مسلمین کے ساتھ رہنا، اِس لئے کہ اُن کی دعائیں ایسے شخص کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہوتی ہیں۔

یہاں لفظِ "غِلّ" میں قلب کی تمام بری صفات داخل ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ مذکورہ تین خصلتوں کے ہوتے ہوئے قلب میں خیانت، نفاق، اور حسد وغیرہ نہ ہو گا، ایسا قلب صدق کی دولت سے مالا مال ہو گا، ان خصالِ ثلاث میں خیر خواہی والی خصلت اِس لحاظ سے اہم ہے، کہ یہ باقی دو خصلتوں کے حصول میں معین ہے۔

ہمارے اَسلاف اور جذبۂ خیر خواہی:

ہمارے اسلاف کو حق تعالیٰ نے صفاتِ صدق کا اعلیٰ درجہ عطا فرمایا تھا، اسی لئے ہمارے اَسلاف کی تاریخ، جذبۂ خیر خواہی سے بھری ہوئی ہے، اَسلاف میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی، تمام زندگی مسلمانوں کی

خیر خواہی کے لئے جدوجہد فرماتے رہے، اکبر بادشاہ کے خود ساختہ "دینِ الٰہی" کی بیخ کنی کے لئے حضرت نے جو جدوجہد فرمائی وہ صداقتِ قلب پر مرتب ہونے والی خیر خواہی کے جذبہ کی زندہ مثال ہے۔

اکبر بادشاہ نے دینِ الٰہی کے نام سے ایک نیا دین شروع کیا، ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اُس کا اجمالاً تذکرہ فرماتے تھے، کہ اکبر بادشاہ کو لوگوں نے یہ سمجھایا تھا، کہ حضور اکرم ﷺ جو دین لے کر آئے تھے، اُس کی مدت تو پوری ہو گئی ہے، اب ایک نئے دین کی ضرورت ہے، اور بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ آپ مجدد ہو، ایک نیا دین ایجاد کر سکتے ہو، تاریخ میں اس کی تفصیل ہے۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اِس قسم کی باتیں سُجھانے والے علماءِ سوء تھے، ابتدا میں بادشاہ کے حالات بہت اچھے تھے، خود بھی عبادت گذار تھا، اور علم و علماء کا بڑا قدردان تھا، کیونکہ ابتدا میں اُس کے مصاحب مخلص اور باعمل علماء تھے، وہ اُسے راہِ حق سے ہٹنے نہیں دیتے تھے، لیکن پھر آہستہ آہستہ علماءِ سوء اس کے قریب ہوتے گئے تو علمائے مخلصین پیچھے ہٹتے چلے گئے۔

بہر حال اُس نے ایک نیا دین شروع کیا، اُس میں بہت سی باتیں ہندو مذہب کی، کچھ باتیں سکھ مذہب کی اور بدھ مذہب کی، اور کچھ عیسائی مذہب کی شامل کیں، اور برائے نام اسلام کی کچھ باتیں بھی شامل کیں، اس طرح ایک نیا دین تیار کیا، اور اُس کا نام دین الٰہی تجویز کیا، در حقیقت یہ نیا دین کفر و شرک کا مجموعہ تھا اور اسلام کا مدِّ مقابل تھا، اُس نے یہ اعلان کیا، کہ تمام لوگوں کو اِس دین پر چلنا ہے، اور یہی دین سب کو اختیار کرنا ہے، تاریخ میں

ہے کہ وہ وقت بہت نازک تھا۔

ایسا نازک دور تھا کہ برِّ صغیر سے مذہبِ اسلام کا نام ونشان مٹنے کے قریب ہو گیا تھا، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان وغیرہ، اِس پورے برِّصغیر میں اُس کی بادشاہت تھی، یہ سب مقامات اُس کے زیرِ اثر تھے، اُس نے سب کے لئے عام قاعدہ بنا دیا کہ تمام لوگوں کو اِس نئے دین کا اتباع کرنا ہے، سب کے لئے یہی دین واجب الاتباع ہے، جبری طور پر اُس کو نافذ کرنا چاہا، مسلمان حیران اور پریشان تھے لیکن اُس وقت کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ بادشاہ کو کچھ کہا جا سکے، اس پر نکیر کی جا سکے، اللہ نے اُس مشکل وقت میں اپنے مخلص بندے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کو کھڑا کیا، اُنہوں نے اسلام کے اِحیاء کا بیڑا اٹھایا، اور پختہ عزم کیا کہ مجھے اِس ناپاک کوشش کو ناکام کرنا ہے، اور اسلام کو اصل صورت پر واپس لانا ہے۔

مجدد الف ثانیؒ کی اِحیاءِ اسلام کے لئے جدوجہد:

آپ نے اللہ پر بھروسہ کر کے اِس کے لئے کوششیں شروع فرمائیں، اور اِس کی ابتدا اِس طور پر کی کہ اکبر بادشاہ کے جو مقرّبین اور اُس کے وزراء تھے، اُن کے نام اصلاحی ودعوتی خطوط لکھے، اسلام کے لئے سلَف کی قربانیاں یاد دلا کر اُن وزراء کو غیرت دلائی، کہ تمہاری موجودگی میں اور تمھیں ذریعہ بنا کر اسلام جیسے پاکیزہ مذہب کو مٹایا جا رہا ہے، مرنے کے بعد اللہ کو کیا منھ دکھاؤ گے، اِس طرح کی مہمیز مقرّبین اور وزراء کو لگائی، جس سے اُن کے قلب میں ایمان کی حرارت پیدا ہوئی اور اُن میں سے بہت سے وزراء اِس سلسلے میں سوچنے پر مجبور ہوئے، اور اسلام کی شمع روشن ہونے کی امید

بند ھنے لگی، لیکن یہ کوشش پھر اُس وقت جمود اختیار کر گئی، جب بادشاہ کے درباریوں نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلاف بادشاہ کو ورغلانا شروع کیا ،خاص طور پر جو علماءِ سوء تھے اُنھوں نے بادشاہ سے شکایت کی، اور یوں کہا کہ سرہند میں ایک شخص ہے احمد نام کا ،وہ اپنے آپ کو شیخ کہلاتا ہے، اور وہ تمھاری حکومت کا مخالف ہے، وہ تمھارا باغی ہے، اور کہا کہ اُس کی پہچان یہ ہے کہ جب آپ اُس کو اپنے دربار میں بلائیں گے ،تو وہ آپ کے لئے سجدۂ تعظیمی نہیں کرے گا (اکبر بادشاہ اپنے لئے سجدۂ تعظیمی کرایا کرتا تھا)۔

چنانچہ اکبر بادشاہ نے وارنٹ بھیجا ،اور حضرتؒ کو طلب کیا، حضرت وہاں پہنچے، تو حضرت نے اسلامی ضابطے کے مطابق سلام مسنون پیش کیا، اور سجدہ نہیں کیا۔

اکبر بادشاہ نے اُن سے کہا، کہ آپ نے ہمارے لئے تعظیمی سجدہ کیوں نہیں کیا؟ حضرتؒ نے فرمایا غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی جائز نہیں ہے، اُس کے مصاحبین میں جو علماءِ سوء تھے ، وہ مناظرہ اور مقابلہ کے لئے تیار ہوئے، حضرتؒ نے اِس موضوع پر قرآنِ مجید سے ،اور احادیثِ شریفہ سے دلائل بیان کئے ،اور یہ ثابت فرمایا کہ غیر اللہ کے لئے سجدہ حرام ہے ،وہ مصاحبین مناظرے میں ناکام ہوئے، حضرت کو واپس کیا گیا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا ابتلاء:

پھر اُن مصاحبین نے اکبر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ یہ تمھاری حکومت کے مخالف ہیں، اگر اِن کا علاج نہیں کیا گیا، تو یہ تمھارا تختہ پلٹ دیں گے ، لہٰذا مناسب یہ ہے کہ اُن کو قتل کرا دیا جائے ،یہ سازش اُنھوں نے رچی ، لیکن

اُسی دوران اکبر بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اُس کی جگہ پر جہانگیر بادشاہ بنا، جہانگیر کو بھی مصاحبین اور علماءِ سوء نے یہ پٹی پڑھائی کہ شیخ احمد سرہندی، تمہارے والد کی حکومت کے بھی مخالف رہے ہیں، اور تمہارے بھی مخالف ہیں، اُس نے بھی حضرت کو بلایا، حضرت نے اُس کو بھی سجدۂ تعظیمی نہیں کیا، یہ ناراض ہوا اور حضرتؒ کو گوالیار کی جیل میں بند کرا دیا، یہ جیل اُجّین میں ہے، اُس وقت نظم ونسق کے لحاظ سے اُجّین گوالیار کے تحت آتا تھا، ایک مرتبہ بندہ کا اُجّین کا سفر ہوا تو لوگوں نے وہ جیل باہر سے دکھائی اور بتایا کہ حضرت اِسی جیل میں قید رہے۔

نورانی شخص سے نور پھیلتا ہے:

لیکن جو شخص نورانی ہوتا ہے، اُس کے ذریعہ سے ہر جگہ نور پھیلتا ہے، چنانچہ حضرتؒ نے جیل میں بھی تعلیم کا، تدریس کا، بیعت واصلاح کا سلسلہ شروع فرما دیا، اور جو قیدی تھے حضرتؒ کی محنت سے اُن کے حالات بہت اچھے ہو گئے، کسی نے قرآن پڑھ لیا، کوئی حافظ بن گیا، کتنوں نے عربی زبان پڑھنا شروع کر دی، اور بہت سے لوگ حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہو کر بڑے اولیاء اللہ بن گئے۔

جہانگیر بادشاہ کا خواب اور بیعت ہونا:

اُسی دوران جہانگیر بادشاہ نے خواب دیکھا، کہ میدان محشر قائم ہے، اور حضور اکرم ﷺ براق پر سوار ہیں، جہانگیر بادشاہ حضور اکرم ﷺ کے روبرو حاضر ہے، حضور اکرم ﷺ نے اپنی انگلی دانتوں کے اندر دبا رکھی ہے، اِس حال میں جہانگیر سے مخاطب ہو کر فرمایا، جہانگیر! تو نے کتنے بڑے

آدمی کو جیل خانہ میں ڈال رکھا ہے؟ جہانگیر گھبرا کر بیدار ہوا، فوراً توبہ کی، اور حضرت کی رہائی کا فرمان جاری کیا، حضرت کو اپنے پاس بلایا، بہت اکرام کیا، اور معافی کا خواستگار ہوا، اور اپنے پاس قیام کی درخواست کی، حضرت نے دینی مصلحت کی وجہ سے اس کو منظور فرمایا، اور بڑے پیمانے پر اصلاحی محنت شروع فرمائی، جہانگیر بادشاہ کی عقیدت حضرت سے بڑھتی رہی، بادشاہ اور اُن کے اہل خانہ حضرت کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، حضرت کے بعد آپ کی اولاد (خواجہ معصوم وغیرہ) کے ذریعہ شاہی خاندان میں یہ نقشبندی سلسلہ چلتا رہا، چنانچہ جہانگیر کے بعد شاہ جہاں، اور اُن کے بعد شاہ عالمگیر اور اُن کے متعلقین اصلاح واِسترشاد کے لئے اِسی سلسلے سے وابستہ رہے۔

حاصل یہ کہ حضرت مجدد صاحبؒ کی مساعی سے اکبر بادشاہ کے خود ساختہ دینِ الٰہی کی بیخ کنی ہوئی، اسلام کی شمع روشن ہوئی، اور اللہ کے اُس بندے کے ذریعہ پورے برِّ صغیر میں اسلام کا تحفظ ہوا۔

حضرت مجدد صاحبؒ کی زندگی کا یہ کارنامہ جو بعد والوں کے لئے بھی راہنما خطوط کی حیثیت رکھتا ہے، صداقتِ قلب پر ہی متفرع ہے، کیونکہ جب قلب میں صداقت آجاتی ہے تو آدمی کی سوچ مثبت ہو جاتی ہے، ایسا شخص اپنی تمام توانائیاں اسلام کے تحفظ اور مسلمانوں کی منفعت و خیر خواہی کے لئے صرف کرتا ہے، یہ صدقِ قلب کے اثرات اور نتائج ہوتے ہیں۔

صداقتِ قلب کا ایک اور ثمرہ: توجہ الی اللہ اور قلبی یکسوئی کا حصول:

صدقِ قلب کی صفت میں جس قدر ترقی ہوتی ہے، اُسی قدر اِنابت الی اللہ اور قلبی یکسوئی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، امام غزالیؒ کے ایک کلام سے اِس کی وضاحت ہوگی۔

طہارت کی چار قسمیں:

امام غزالیؒ نے طہارت کی چار قسمیں بیان فرمائیں:

(۱) تَطْهِيْرُ الْبَدَنِ عَنِ الْحَدَثِ وَالْخَبَثِ۔

بدن کو پاک کرنا ''خبث'' یعنی ظاہری نجاست سے، اور ''حدث'' یعنی باطنی نجاست سے۔ باطنی نجاست سے مراد بے وضو اور بے غسل ہونا ہے، یہ بھی طہارت کا ایک درجہ ہے۔

(۲) تَطْهِيْرُ الْاَعْضَاءِ عَنِ الْمَعَاصِيْ۔

اعضاء وجوارح کو گناہوں سے پاک کرنا۔

(۳) تَطْهِيْرُ النَّفْسِ عَنِ الْاَخْلَاقِ الذَّمِيْمَةِ۔

اپنے نفس کو اخلاقِ رذیلہ اور اخلاقِ ذمیمہ سے پاک کرنا۔

(۴) تَطْهِيْرُ الْقَلْبِ عَمَّا سِوَى اللّٰهِ تَعَالٰى۔

اپنے قلب کو ماسوی اللہ سے پاک کرنا۔

امام غزالیؒ نے طہارت کی یہ چار اقسام بیان فرمائیں، اِن میں چوتھی قسم سے مراد توجہ اِلی اللہ اور قلب کی یکسوئی ہے جو صدقِ قلب پر متفرع ہوتی ہے، یعنی صدقِ قلب کے لئے جو افعال واخلاق درکار ہیں جن کی کچھ تفصیل ماقبل میں آئی جب وہ قلب میں راسخ ہو جاتے ہیں تو اس کے آثار و ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ان میں سے ایک اہم اثر اور ثمرہ یہ ہے کہ ایسے شخص کی ہمہ تن توجہ اللہ کی طرف ہو جاتی ہے اور قلبی یکسوئی کی دولت عطا ہوتی ہے۔

پھر یہ کیفیت اولیاء اللہ میں مختلف انداز سے پائی جاتی ہے، بعض حضرات ظاہری طور پر بھی ماسوی اللہ سے بے خبر ہو جاتے ہیں، اور بعض

حضرات دین اور دنیا کے امور بھی انجام دیتے ہیں، لیکن اُن کی مکمل توجہ ہر حال میں اللہ کی طرف ہوتی ہے، قلب کی لو اللہ سے جڑی رہتی ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت صابر کلیریؒ کا حال :

ہمارے حضرت مفتی محمود صاحبؒ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے، کہ بابا فرید الدین شکر گنجیؒ سے ایک شخص نے سوال کیا، کہ آپ کے خُلفاء کون ہیں کہاں ہیں؟ بابا فرید الدین نے دو کا نام بتایا، ایک سلطان الاولیاء خواجہ نظام الدینؒ اور دوسرے حضرت صابر کلیریؒ۔

وہ شخص چلا اور نظام الدین پہنچا، حضرت خواجہ صاحبؒ سے ملاقات کی، اور بتایا کہ میں تمہارے شیخ کے پاس سے آیا ہوں، اُنہوں نے مجھے آپ کا نام بتایا ہے، خواجہ صاحبؒ نے جب شیخ کا نام سنا، تو حد درجہ مسرور ہوئے، اُن کا بہت اکرام کیا، استقبال کیا، احترام کیا، اور اُن کے لئے نئے کپڑے بنوائے ، اور قیام کے لئے اچھی جگہ دی، اور اُن کی ضیافت کا سلسلہ شروع کیا، دستر خوان پر طرح طرح کی نعمتیں اور قسم قسم کے کھانے منگائے جاتے، غرضیکہ اُن کا خوب اکرام کیا، خوب احترام کیا، جب وہ جانے لگے تو بڑے ہدایا اور تحائف دئے، کہ یہ میرے شیخ کے فرستادہ ہیں، میرے شیخ کے پاس سے آئے ہیں۔

اُس کے بعد یہ صاحب حضرت صابر کلیریؒ کے یہاں گئے ، دیکھا کہ حضرت مراقبہ میں ہیں، خادم سے کہا کہ میں بابا فرید صاحبؒ کے یہاں سے آیا ہوں، اُنہوں نے مجھے حضرت صابر صاحبؒ کی ملاقات وزیارت کے لئے بھیجا ہے، میری ملاقات کراؤ۔

خادم نے حضرت کو اطلاع دی، حضرت صابر صاحبؒ مراقبہ میں تھے،

خادم نے متوجہ کرنا چاہا، لیکن متوجہ نہیں ہوئے، خادم نے حضرت کا کاندھا پکڑ کر ہلایا، پھر حضرت متوجہ ہوئے، پوچھا کیا بات ہے؟ مہمان نے کہا کہ حضرت! میں آپ کے شیخ بابا فرید الدین شکر گنجیؒ کے یہاں سے آیا ہوں، انہوں نے مجھے بھیجا ہے، آپ کی زیارت وملاقات کے لئے حاضر ہوا ہوں، صابر صاحبؒ نے فرمایا اچھا تجھے میرے شیخ نے بھیجا ہے؟ مہمان نے کہا، کہ جی ہاں آپ کے شیخ نے بھیجا ہے، پوچھا میرے شیخ کا کیا حال ہے؟ وہ کیسے ہیں؟ مہمان نے عرض کیا کہ الحمدللہ، وہ بہت اچھے ہیں خیریت سے ہیں، حضرت نے یہ سن کر فرمایا کہ بہت اچھا، پھر اپنے مراقبہ میں مشغول ہو گئے، خادم کو بس اتنا کہا کہ آج ''گولر'' میں کچھ نمک ملا لینا کیونکہ مہمان آئے ہوئے ہیں، وہاں کے گولر مشہور تھے۔

بہر حال اُس کے بعد حضرت صابر صاحب نے مہمان سے اور کوئی بات نہیں کی، یہ ایک دو دن رہے پھر واپس آ گئے۔

حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا حضرت صابر کلیری سے اپنا نام سن کر وجد میں آجانا:

یہ صاحب واپس ہوئے اور بابا فرید صاحبؒ کے پاس پہنچے اور جا کر خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی تو خوب تعریفیں کیں، کہ ماشاء اللہ وہ تو بہت با اخلاق ہیں، بہت قدر کرنے والے ہیں، بہت مہمان نواز ہیں، اُنہوں نے میرا اِکرام کیا، اس طرح سے میری خدمت کی، اُن کی خوب تعریفیں کیں، اور صابر کلیریؒ کی کوئی خاص تعریف نہیں کی، بابا فرید صاحبؒ نے کہا کہ بھائی صابر صاحبؒ سے بھی ملے یا نہیں ملے؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ملاقات تو ہوئی ہے،

لیکن وہ تو بولتے ہی نہیں، وہ تو کچھ بات کرنے کے لئے ہی تیار نہیں، بابا فرید صاحبؒ نے کہا کیا بات ہوئی؟ کچھ بات اُن سے ہوئی یا نہیں ہوئی؟ کہا کہ جی اتنی بات ہوئی کہ جب میں نے اُن سے عرض کیا کہ میں آپ کے شیخ کے پاس سے آیا ہوں، تو مجھ سے اتنا پوچھا کہ میرے شیخ اچھے ہیں؟ کیا حال ہے ان کا؟ اِس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی، حضرت اِس بات کو سن کر وجد میں آگئے، اور کہا کہ اللہ کا فضل اور احسان ہے کہ میرے اُس مرید نے میرا حال پوچھا، ارے میرا یہ مرید اتنے سال سے غالباً تیس سال کا عرصہ بتلایا، کہ تیس سال سے اِس حالت میں ہے، کہ اُس کے قلب میں ماسوی اللہ کا گذر بھی نہیں ہوا، اُس نے میرا حال پوچھا، میری خیریت پوچھی، یہ تو بڑی بات ہے، مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میری خیریت پوچھیں گے، اُنہوں نے بہت بڑے حوصلے کا کام کیا۔

لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، کہ ہر ایک کے لئے ایک ہی کیفیت ضروری نہیں، جس طرح پھولوں کے باغیچہ میں متعدد انواع و مختلف رنگ اور مختلف خوشبو کے پھول ہوتے ہیں، اور اُسی سے باغیچہ کی رونق ہے، اِسی طرح باغیچۂ ولایت میں اہل اللہ مختلف انواع و مختلف ذوق کے ہوتے ہیں، ہر ایک کو ایک معیار پر پرکھنا صحیح نہیں ہے۔

قلبی یکسوئی کا مطلب :

قلبی یکسوئی کا مطلب اتنا ہے کہ دل ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہے، اکثر اوقات دل اللہ کا ذکر کرے، یا اُس کی طرف متوجہ رہے، جس کے نتیجہ میں غیر اللہ سے توجہ ہٹی ہوئی ہو۔

حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ پہلے مجھے اِس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا، کہ حضور ﷺ کا اللہ جل شانہ کے ساتھ ہر آن اور ہر وقت تعلق قائم تھا، وحی نازل ہورہی ہے، اور ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان اور خیال مستحضر ہے، اور اللہ تعالی کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کی تجلیات ہر وقت آپ پر ہورہی ہیں، جس شخص کی یہ کیفیت ہو وہ کیسے دنیاوالوں سے بات کرلیتاہے، اور کیسے ازواجِ مطہرات کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں کرلیتا ہے، وہ کیسے بچوں کے ساتھ کھیل لیتاہے، ایسی ذات کو تو مخلوقات کی طرف دھیان بھی نہیں ہونا چاہئے، پھر فرمایا کہ اب الحمدللہ معلوم ہوگیا کہ یہ دونوں کام جمع ہوسکتے ہیں، اُس کے بعد حضرت نے اپنی کچھ کیفیت بیان فرمائی جس سے ان دونوں چیزوں کا جمع ہونا بخوبی واضح ہوجاتاہے۔

ایک بزرگ کا مشاہدہ :

ایک بزرگ حج کے لئے گئے ، اُنہوں نے کہا، کہ ایک شخص کو میں نے دیکھا، خانۂ کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعا کررہاہے، میں نے اُس کے قلب کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ اُس کا قلب غافل ہے، اُس کی توجہ اللہ کی طرف نہیں ہے، وہ دعا بھی مانگ رہاہے، خانۂ کعبہ کا پردہ بھی پکڑے ہوئے ہے لیکن اس کا دل اللہ کی طرف متوجہ نہیں۔

اِس کے برعکس منیٰ میں ایک شخص کو دیکھا، وہ کپڑا افروخت کررہاہے، تاجرہے، دن بھر اُسی کام میں لگارہا، میں نے اُس کے قلب کی طرف توجہ کی تو مجھے نظر آیا، کہ وہ سب کچھ کررہاہے، کپڑا فروخت کررہاہے، لوگوں سے باتیں بھی کررہاہے، لیکن ایک آن کے لئے بھی اُس کا دل اللہ سے غافل نہیں ہے۔

مومن بندہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے جب مجاہدہ اختیار کرتا ہے اور اپنے قلب کو سنوارنے کے لئے محنت کرتا ہے، تو حق تعالیٰ شانہ قلب میں ایک صلاحیت پیدا فرمادیتا ہے، جس سے یکسوئی کی صفت حاصل ہو جاتی ہے، ایسا شخص لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے، دوسرے کام بھی کرتا ہے، لیکن اُس کی ہمہ تن توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہے، ہمہ وقت اللہ کا مطیع اور فرماں بردار رہتا ہے، لیکن ان کیفیات کا حصول اُسی وقت ہوتا ہے جب آدمی اللہ کے برگزیدہ بندوں کی (جن کو صادقین سے تعبیر کیا گیا) صحبت اور معیت اختیار کرتا ہے، اسی لئے آیتِ مذکورہ (جو خطبہ میں پڑھی گئی) میں صادقین کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حق تعالیٰ شانہ ہمیں اِس کی توفیق عطا فرمائے۔

یہ صدق کے پہلے درجہ کا بیان ہوا، جس کو صدقِ جنان اور صدقِ قلب سے تعبیر کیا گیا، جب آدمی اِس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو اُس کے عقائد واخلاق شریعت کے مطابق پختہ ہو جاتے ہیں، اُس کی سوچ اچھی ہو جاتی ہے، مثبت ہو جاتی ہے، اُس کی سوچ خیر خواہی والی ہو جاتی ہے، پھر وہ اپنی صلاحیتوں کو اُسی خیر خواہی کے لئے صرف کرتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس کو قلبی یکسوئی اور ہمہ وقت توجہ الی اللہ کی دولت بھی حاصل ہو جاتی ہے جو مقصودِ اصلی ہے۔

صدق کے باقی تین درجے انشاءاللہ باقی تین مجلسوں میں بیان کئے جائیں گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجلس (۲)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَسَلَّمَ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ. اَمَّا بَعۡدُ!

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصَّادِقِیۡنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

اس سے پہلے کی مجلس میں جو مضمون بیان کیا تھا اُسی کا دوسرا حصہ آج کی مجلس میں انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے صادقین کی معیت اور اُن کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ﴾ ”اے ایمان والو! تم تقویٰ اختیار کرو“ ﴿وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصَّادِقِیۡنَ﴾ ”اور صادقین (جو اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں) اُن کی معیت اختیار کرو، اُن کی صحبت اختیار کرو“۔

جب بندہ صاقین کے زُمرے میں داخل ہو جاتا ہے، تو بافیض ہو جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ شانہ اُس سے کام لیتا ہے، اِس لئے اُن کی صحبت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

بتایا گیا تھا کہ ہمارے حضرت شیخ یونسؒ صدق کے چار درجے واقسام

بیان فرمایا کرتے تھے، پہلا درجہ صدق فی الجَنان ہے جس پر اِس سے پہلے کی مجلس میں کلام آچکا ہے۔

صدق کا دوسرا درجہ: صدق فی اللسان

صدق کا دوسرا درجہ صدق فی اللسان ہے، آج کی مجلس میں اِسی کی تشریح کا ارادہ کیا ہے، حق تعالٰی شانہ صحیح تشریح کی توفیق بخشے۔

صدق فی اللسان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی زبان سچی ہو، ہمیشہ سچ بولنے کا اہتمام کرے، جھوٹ سے احتراز کرے حق تعالی شانہ کا پاک ارشاد ہے:

﴿وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ (الحج آیت ۳۰)

کہ جھوٹ کہنے سے بچو، جھوٹ کے اندر ایک گندگی ہوتی ہے، ناپاکی ہوتی ہے، بدبو ہوتی ہے، حدیث شریف کے اندر آیا ہے کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو ملائکہ اُس جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے ایک میل کی دوری پر چلے جاتے ہیں، بہت سی باتیں عام لوگوں کو محسوس نہیں ہوتیں، لیکن اللہ کے مقرب بندوں کو وہ چیزیں نظر آتی ہیں، اور وہ ان کو محسوس کرتے ہیں، جھوٹ کی بدبو ہم لوگوں کو محسوس نہیں ہوتی، لیکن ملائکہ کو جھوٹ کی بدبو محسوس ہوتی ہے، اُس کی بدبو سے پریشان ہو کر وہ ایک میل دور چلے جاتے ہیں۔

اِس ناپاکی اور گندگی سے قلب سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، کیونکہ قلب کا زبان سے بہت گہرا تعلق ہے، جھوٹ بولنے سے قلب میں سیاہی، تاریکی، اور غفلت آجاتی ہے، جس سے قلب کی استعداد کم ہونے لگتی ہے، ایسے شخص کو وساوس اور خیالات گھیرے رکھتے ہیں، اس کا برائیوں کی طرف ذہن چلتا ہے، عبادات میں جی نہیں لگتا، عبادات کی لذت میسر نہیں آتی۔

کذب کا روحانی نقصان:

امام غزالی نے لکھا ہے، کہ ویسے تو اعضاء کے تمام کاموں کا اثر قلب پر پڑتا ہے، مگر زبان چونکہ قلب کی سفیر ہے، اور جو نقشہ قلب میں کھنچتا اور جس چیز کا تصور دل میں آتا ہے، اُس کا اظہار زبان ہی کیا کرتی ہے، اِس لئے اُس کی تاثیر دل پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے، جب زبان جھوٹی ہو جاتی ہے تو دل میں بھی صورتِ کاذبہ کی تصویر کھنچتی اور کجی آجایا کرتی ہے، خصوصاً جب کہ جھوٹ کے ساتھ فضول ولغو گوئی بھی شامل ہو، تو اُس وقت تو قلب بالکل ہی سیاہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کثرتِ کلام سے قلب مر جاتا ہے، اور معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کی قابلیت اُس میں نہیں رہتی۔ (تبلیغ دین للامام غزالی ص۹۵)

صدق اگر چہ کذب کا مقابل ہے، لیکن امامِ غزالی کے مذکورہ کلام سے معلوم ہوا کہ یہاں صدقِ لسان کے مفہوم میں عموم ہے، زبان کو تمام خرافات سے بچانا زبان کے صدق میں داخل ہے، جھوٹ، غیبت، بہتان، ایذا اور تکلیف کی بات، طنز، تبصرہ، فضول ولغو گوئی، یہ سب چیزیں زبان کی خرافات ہیں، اِن سب سے زبان کو پاک رکھنا صدق فی اللسان میں داخل ہے، حدیث شریف میں ہے کہ زبان کے کرتوت، بہت سے لوگوں کو اوندھے منھ جہنم میں دھکیلیں گے۔

زبان کی گفتگو ریکارڈ کرنے کے لئے ملائکہ مقرر ہیں:

حق تعالیٰ شانہ نے بندوں کے افعال پر ملائکہ کو نگراں مقرر فرمایا ہے، کراماً کاتبین بندوں کے افعال کو لکھنے پر مقرر ہیں، انسان جو بھی عمل کرتا ہے یہ دونوں فرشتے اُس کو اُس شخص کے نامۂ اعمال میں لکھ دیتے ہیں، عمل اچھا ہو یا

بُرا، چھوٹا ہو یا بڑا، بہر حال اُس کو نامۂ اعمال میں درج کر لیا جاتا ہے، محفوظ کر لیا جاتا ہے، قرآن کریم کی متعدد آیات میں ملائکہ کی یہ نگرانی مذکور ہے، سورۂ قٓ میں تمام اعمال پر نگرانی کو بیان کرتے ہوئے انسان کی زبان کے اوپر نگرانی کو بطورِ خاص بیان کیا گیا ہے، باقی اعضاء وجوارح کی بنسبت زبان کا عمل زیادہ ہے، گناہ بھی زبان سے زیادہ صادر ہوتے ہیں، اور طاعت وعبادت کے کام بھی زبان سے زیادہ انجام دئے جاسکتے ہیں، اِس لئے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی نگرانی کو اہتمام سے بیان کیا گیا، سورۂ قٓ میں ہے:

﴿اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ (قٓ:۱۷)

کہ جب دو اخذ کرنے والے فرشتے انسان کے اعمال کو، جب وہ اس سے صادر ہوتے ہیں اخذ کرتے رہتے ہیں، جو کہ داہنی اور بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں (اور برابر ہر عمل کو لکھتے رہتے ہیں، اس کی یہ کیفیت ہے کہ) وہ کوئی لفظ منھ سے نہیں نکالنے پاتا، مگر اُس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا موجود ہوتا ہے، (اگر وہ نیکی کا کلام ہو، تو داہنے والا اس کو ضبط اور تحریر میں لاتا ہے ، اگر بدی کا کلام ہو، تو بائیں والا، اور جب زبان سے نکلنے والا ایک ایک کلمہ محفوظ ومکتوب ہے تو دوسرے اعمال کیوں نہ ہونگے)۔

ہر ہر لفظ کا ریکارڈ ہونا:

''مَا یَلْفِظُ'' میں ''مَا'' عموم کے لئے ہے، جو لفظ بھی بندہ اپنی زبان سے نکالتا ہے، ہر لفظ کو اور ہر بولے ہوئے بول کو یہ دونوں فرشتے نامۂ اعمال میں لکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

انسان کی روزانہ کی گفتگو کی مقدار:

علامہ عبد الماجد دریابادیؒ نے لکھا ہے کہ ملکِ روس کے ایک سائنس داں نے اِس بات پر ریسرچ کیا ہے، کہ شب وروز میں انسان کے بولنے کا تناسب کیا ہوتا ہے، اُس نے اپنی تحقیق یہ بتائی کہ اگر کوئی عارض پیش نہ آئے، تو انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے چوبیس گھنٹے میں تین گھنٹہ بیس منٹ بولتا ہے، اگر کوئی عارض پیش آجائے، تو بعض مرتبہ نہیں بولتا یا کم بولتا ہے، اور کبھی بیان وغیرہ کرنا پڑے تو زیادہ بھی بولتا ہے، گھنٹوں تقریر کرتا ہے، یہ تو عوارض ہیں، لیکن انسان کو اُس کی اپنی طبیعت پر چھوڑ دیا جائے، تو معتدل اور نارمل حالت میں اُس کے جو بولنے کا زمانہ اور مدتِ وقت ہے، وہ چوبیس گھنٹہ میں سے تین گھنٹہ بیس منٹ ہے، اور انسان ایک منٹ میں پچاس الفاظ بولتا ہے، ایک منٹ میں پچاس الفاظ کو ملحوظ رکھ کر تین گھنٹہ بیس منٹ میں زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی مجموعی تعداد دس ہزار بنتی ہے، اور کبھی ضرورت کی وجہ سے زیادہ بولنا پڑے یا کسی کو عبث کلام اور فضول گوئی کی عادت ہو، تو یہ تعداد دس ہزار سے بہت متجاوز ہوجائیگی، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ انسان اپنی زندگی میں لاکھوں اور اربوں الفاظ بولتا ہے، اور آیتِ بالا کی صراحت کے مطابق اعمال لکھنے پر جو فرشتے مقرر ہیں وہ فرشتے ہر لفظ کو لکھ لیتے ہیں، محفوظ کرلیتے ہیں، اُس کے نامۂ اعمال کے اندر درج کرلیتے ہیں۔

اپنا حساب خود لے لے:

بندہ قیامت کے دن اللہ کے روبرو حاضر ہوگا، اللہ فرمائے گا:

﴿اِقْرَءْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ (بنی اسرائیل:۱۴)

اے بندے ہم تیرا کیا حساب لیں، تو اپنا حساب خود لے لے، اپنے

نامۂ اعمال کو پڑھ لے، بندہ جب اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو حیرت اور تعجب سے کہے گا:

﴿مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصَاهَا﴾ (الکہف:۴۹)

اِس کتاب کو یعنی نامۂ اعمال کو کیا ہو گیا کہ اِس نے نہ میرے بڑے گناہ کو چھوڑا، اور نہ چھوٹے گناہ کو چھوڑا، میرے ہر گناہ، ہر عمل، اور ہر ہر لفظ کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔

اِس لئے دوستو زبان کی حفاظت کا معاملہ نہایت اہم ہے، اور بہت نازک ہے، زبان کو تمام غیر شرعی امور سے، خرافات سے، تمام آفتوں سے محفوظ رکھنا، صدقِ لسان میں داخل ہے۔

صدقِ لسانی سے خشیتِ الٰہی کا حصول:

جیسا کہ بتایا گیا قلب اور زبان کا گہرا تعلق ہے، سچ بولنے کا اہتمام کرنے سے، اور جھوٹ وفضول گوئی سے زبان کی حفاظت کرنے سے قلب کی قابلیت بڑھتی ہے، اور اس میں اعلی صفات پیدا ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، پھر بندہ کے قلب میں اللہ کا خوف آجاتا ہے، اور خشیتِ الٰہی پیدا ہو جاتی ہے، جو قلب کی اعلی صفات کے لیے اساس اور بنیاد ہے۔

قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر صدق اور تقوی کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے: ﴿أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) یعنی یہی لوگ سچے ہیں اور یہی متقی ہیں۔

اور ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ (الزمر:۳۳) یعنی جو سچی بات پیش کرے اور خود بھی اس کی تصدیق کرے وہی در حقیقت متقی ہے۔

اور فرمایا گیا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹) کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

صدق اور تقویٰ کے اس ایک ساتھ تذکرہ سے ظاہر ہے کہ ان دونوں میں باہم گہرا ربط ہے اور یہ ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، اور تقویٰ؛ خشیتِ الٰہی اور خوفِ خدا ہی کا نام ہے۔ پھر زبان چونکہ قلب کی ترجمان ہے، اس لیے زبان کے صدق کے اہتمام کو قلب میں تقویٰ اور خشیتِ الٰہی پیدا ہونے میں بڑا دخل ہے۔

جب اللہ جل شانہ کسی بندے کو نوازنا چاہتا ہے تو اُس کے دل میں صدق کا جذبہ پیدا فرمادیتا ہے، پھر وہ شخص اپنے قلب سے بھی صدق کا اہتمام کرتا ہے، زبان سے بھی صدق کا اہتمام کرتا ہے، عمل سے بھی صدق کا اہتمام کرتا ہے، اور اس طرح وہ متقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔

صدق کی برکت سے تزکیۂ نفس:

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کا کچھ تذکرہ اس سے پہلے کی مجلس میں کیا گیا، حضرت بڑے عالم تھے، بافیض تھے، لیکن اُن کے علم میں جو نورانیت آئی، اور برکت آئی، اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا جو بڑا کام اُن سے لیا، جس کی تفصیل پہلے بتائی گئی، اِس کا سبب کیا بنا؟ تھے تو وہ بڑے عالم، لیکن علم میں جو جِلاء آیا، برکت ونورانیت جو آئی، اس کا سبب ایک واقعہ ہوا۔

وہ یہ کہ حضرتؒ نے حجِ بیت اللہ کا ارادہ کیا، اُس کے لئے تیاری فرمائی، اور رختِ سفر باندھا، سرہند سے روانہ ہوئے، اور دہلی پہنچے، پھر آگے کا سفر طے کرنا تھا، دہلی میں اُس وقت کے بڑے بزرگ حضرت خواجہ باقی باللہؒ سے

ملاقات کی، اور اپنا ارادہ بتایا، کہ حضرت ! میں حج کے لئے جارہاہوں، خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے جارہاہوں، حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے فرمایا: اچھا، خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے جارہے ہو؟ صاحبِ خانہ کی بھی زیارت کی ہے یا نہیں؟ تو کہا کہ حضرت !وہ تو نہیں کی، مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی جیسی معرفت ہونی چاہئے ویسی معرفت ابھی حاصل نہیں ہے، پھر عرض کیا کہ اگر آپ مجھے صاحبِ خانہ کی زیارت کرادیں تو میں حج موقوف کردوں، بعد میں حج کرلوں گا، حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے قیام کی اجازت مرحمت فرمادی۔

چنانچہ حضرت سرہندیؒ وہاں ٹھہر گئے اور حج موقوف کردیا، حضرت خواجہ صاحبؒ سے اصلاحی تعلق قائم کرکے اُن کی نگرانی میں ریاضت ومجاہدہ میں مشغول ہوئے، منازلِ سلوک طے کئے، پھر اللہ جل شانہ نے اُن کو بافیض بنایا، اور اُن سے ہدایت کا کام لیا۔

یہ اللہ کی طرف سے صدق کی برکت سے رہنمائی ہوئی، اگر وہ اپنا حال اور اپنا مرض ظاہر نہ کرتے، تو شاید یہ مقام حاصل نہ ہوتا، عام طور پر علم کے اندر ایک نشہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انسان اپنے علم پر ہی اعتماد کرتا ہے، یہ سوچتا ہے کہ ہم نے قرآن پڑھا ہے، تفسیر پڑھی ہے، حدیث پڑھی ہے، اور اُن سب کی تشریح بھی پڑھ رکھی ہے، اور اِس زعم میں بڑوں سے تعلق قائم نہیں کرتا، ایسے لوگ بڑوں کی برکات اور ان کے فیض سے محروم رہتے ہیں۔

طلبِ صادق پر حضور ﷺ کا خواب میں رہنمائی فرمانا:

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو شیخ کی تلاش شروع ہوئی،

خواب دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ کا دربارِ عالی لگا ہوا ہے، مگر میری جانے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، حضرت حاجی صاحبؒ نے کہا کہ میرے ماموں بھی وہاں موجود تھے، میرے ماموں نے میرا ہاتھ پکڑ کر حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک میں دیدیا، حضور اکرم ﷺ نے میرا ہاتھ ایک بوڑھے، نحیف اور کمزور شخص کے ہاتھ میں دیدیا، بیدار ہو گئے، تو اب پریشان ہو گئے کہ وہ بوڑھے اور نحیف شخص کون ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے میرا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیا ہے، تو میری اصلاح وہاں سے ہو گی، مجھے فیض وہاں سے ملے گا، اُن کی تلاش میں بہت دور دراز کے، قریب کے، بعید کے، سفر کئے، لیکن کامیابی نہیں ہوئی، کچھ روز بعد حضرت حاجی صاحب نے اپنے استاذ حضرت مولانا قلندرؒ جلال آبادی سے یہ خواب بیان کیا کہ حضرت! میں نے ایسا خواب دیکھا ہے، لیکن جو صورت آں حضرت ﷺ نے خواب میں دکھائی تھی، میرا ہاتھ جن کے ہاتھ میں دیا تھا، وہ مجھے اب تک نہیں مل رہے ہیں، اُنہوں نے ارشاد فرمایا کہ ذرا لوہاری تو ہو آؤ، لوہاری گئے، وہاں حضرت میاں جی نور محمد جھنجانویؒ رہتے تھے، دور سے دیکھ لیا کہ یہ تو وہی بزرگ ہیں، جن کے ہاتھ میں حضور اکرم ﷺ نے میرا ہاتھ دیا تھا، فوراً قدموں میں گر پڑے، حضرت میاں جیؒ نے سینے سے چمٹا لیا اور فرمایا کہ تمھیں اپنے خواب پر بہت اعتماد ہے۔

حضرت میاں جی نور محمد جھنجانویؒ کی کرامت:

حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ میرے شیخ کی پہلی کرامت تھی جو میں نے دیکھی، کیونکہ میں نے خواب کا تذکرہ نہیں کیا تھا، اور حضرت کو اُس کا علم ہو گیا، اللہ نے وہاں سے فیضیاب فرمایا۔

حضرت میاں جی نور محمد جھنجانویؒ لوہاری میں رہتے تھے، بیمار ہوگئے، تو ارادہ کیا کہ اپنے وطن جھنجانہ چلے جائیں، راستہ میں تھانہ بھون پڑتا تھا، وہاں حضرت حاجی صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، حضرت میاں جیؒ کافی بیمار تھے، آخری وقت تھا، میاں جیؒ نے حاجی صاحبؒ سے ارشاد فرمایا، کہ تم سے کام لینا تھا لیکن اب وقت نہیں رہا، اِس پر حضرت حاجی صاحبؒ رو پڑے کہ انتقال کا وقت قریب آگیا ہے، حضرت میاں جیؒ نے فرمایا کہ رونے کی بات نہیں، رؤومت، تمہیں جو فیض میری زندگی میں حاصل ہوتا تھا، میرے مرنے کے بعد بھی وہی فیض حاصل ہوگا، حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے میرے شیخ سے بعد میں بھی وہی فیض حاصل ہوا، جو اُن کی حیات میں حاصل ہوا، یہ بعض سالکین کے لئے ہوتا ہے، کہ اُن کے شیخ کی وفات کے بعد بھی شیخ سے اُنھیں رہنمائی اور فیض حاصل ہوتا رہتا ہے۔

صدقِ لسانی رؤیائے صادقہ کا ذریعہ:

جو شخص سچا ہوتا ہے، صدق وسچائی کا اہتمام کرتا ہے اُس کا قلب کجی سے محفوظ رہتا ہے، اِس لئے اُس کا خواب عموماً سچا ہوتا ہے، حدیث شریف میں ہے:

«اَصۡدَقُهُمۡ رُؤۡيَا اَصۡدَقُهُمۡ حَدِيۡثًا» (ترمذی ج۲ ص ۵۲)۔

جس طرح اعمالِ صالحہ کی توفیق ملنے میں صدقِ مقال اور اکلِ حلال کا بڑا دخل ہوتا ہے، اِسی طرح خوابوں کے سچا ہونے میں اِن دونوں باتوں کا بڑا دخل ہے، جو شخص حلال وطیب چیزیں کھاتا ہے اور ہمیشہ سچ بولتا ہے، اُس کے خواب زیادہ تر سچے ہوتے ہیں، اِس کے برعکس جو شخص جھوٹا ہوتا ہے،

زبان کی حفاظت کا اہتمام نہیں کرتا، اُس کے خواب اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔

امامِ غزالیؒ نے فرمایا کہ: صدقِ قولی کا کمال یہ ہے کہ بندہ تعریض سے بھی پرہیز کرے، کیونکہ تعریض اگرچہ سچ ہی میں داخل ہے، مگر پھر بھی سننے والا اُس سے خلافِ واقع مضمون سمجھتا ہے، لہٰذا اس سے بھی احتراز کرے، کیونکہ جھوٹ بولنے کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اُس کی وجہ سے قلب کی صورت میں کجی آتی ہے، اور وہ حق کی تجلّی کے قابل نہیں رہتا۔

چنانچہ ایسے شخص کو خواب بھی سچا نظر نہیں آتا، اور تعریض کا اگرچہ یہ ثمرہ نہیں ہوتا، مگر اُس کی صورت چونکہ جھوٹ کے مشابہ ہے اِس لئے اس میں بھی جھوٹ کے مفاسد کا اندیشہ ضرور ہے، پس صدیق کی شان کے مناسب یہی ہے کہ بلا ضرورتِ خاص دوسرے کو تعریض کے ذریعہ سے بھی واقع کے خلاف امر کا دھوکہ نہ دے۔ (تبلیغ دین ص ۲۴۹)

خواب کی اقسام:

یہ تفصیل خواب کی ایک قسم رؤیائے صادقہ کی ہے، کہ صدقِ لسان سچا خواب آنے کا سبب ہے، خواب کی اور بھی اقسام ہیں، اُن کے اسباب دوسرے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ خواب تین طرح کا ہوتا ہے:

ایک ''تسویلِ نفسانی'' جسے اضغاثِ احلام کہا جاتا ہے، یعنی بیداری کی حالت میں جو امور انجام دئے وہ قوتِ خیالیہ میں محفوظ ہوجاتے ہیں، پھر وہ خیالات بصورتِ خواب متمثّل ہوتے ہیں، مثلاً بیداری میں بازار میں گیا، وہاں کوئی چیز خریدی، کسی سے ملاقات کی وغیرہ پھر سوتے ہوئے وہی حالات خواب میں نظر آتے ہیں، یہ اضغاثِ احلام ہیں، اِس کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔

دوسرے ''تخویف من الشیطان'' بعض مرتبہ آدمی ڈراؤنے خواب دیکھتا ہے، مثلاً ایک سانپ اُس کے پیچھے بھاگ رہا ہے، شیر اُس کا تعاقب کر رہا ہے، کوئی شخص اُس پر حملہ کر رہا ہے وغیرہ، اِس قسم کی چیزیں شیطان کی طرف سے ڈراؤنے خواب ہوتے ہیں، اِس کی بھی کوئی تعبیر نہیں ہوتی، یہ شیطان کا اثر ہے اور دل میں وحشت اور خوف پیدا ہوتا ہے، اگر ایسی صورت پیش آئے تو اللہ کی پناہ طلب کرے، ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' کہہ لے، اور اپنی بائیں جانب تین بار تھتکار دے، اور کروٹ بدل کر سو جائے۔ (مشکوٰۃ کتاب الرؤیا فصلِ اول ص ۳۹۴)

تیسری قسم ''رؤیائے صالحہ'' یعنی اچھا خواب ہے، رؤیائے صالحہ کو حدیث شریف میں مبشّرات سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، یہ تیسری قسم یعنی مبشّرات تعبیر کے محتاج ہوتے ہیں، حدیث کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں:

«عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ تَکَدْ رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ تَکْذِبُ وَاَصْدَقُھُمْ رُؤْیًا اَصْدَقُھُمْ حَدِیْثًا»

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جس وقت زمانہ قریب ہو گا، تو مومن کا خواب جھوٹا نہیں ہو گا، سب سے سچا خواب، سب سے سچے مومن کا ہوتا ہے۔ حدیث کا آخری حصہ یہ ہے:

«وَالرُّؤْیَا ثَلٰثٌ. فَالرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ بُشْرٰی مِنَ اللّٰہِ. وَالرُّؤْیَا مِنْ تَحْزِیْنِ الشَّیْطَانِ. وَالرُّؤْیَا مِمَّا یُحَدِّثُ بِھَا الرَّجُلُ نَفْسَہٗ فَاِذَا رَاٰی اَحَدُکُمْ مَا یَکْرَہُ فَلْیَقُمْ وَلْیَشْغُلْ وَلَا یُحَدِّثْ بِہِ النَّاسَ»۔ (ترمذی ج ۲ ص ۵۳)۔

یعنی خواب تین قسم کا ہوتا ہے، (۱) اچھا خواب اللہ کی طرف سے بشارت ہے، (۲) شیطان کی جانب سے ڈراؤنے خواب، (۳) وہ خواب جس کے ذریعہ انسان خود سے بات کرتا ہے پس جب تم میں سے کوئی شخص خواب

میں ناگوار چیز دیکھے، تو اٹھ جائے، اور کام میں مشغول ہو جائے، اور اُس خواب کا کسی سے تذکرہ نہ کرے۔

خواب آنے کی اور وجوہات واسباب:

خواب کبھی کسی خِلطہ کے غلبہ اور بدن میں اس کے اثر سے نظر آتا ہے، خلطہ چار ہیں، (۱) سوداء (۲) صفراء (۳) دم (۴) بلغم، اِن کو اخلاطِ اربعہ کہا جاتا ہے، بدنِ انسانی میں یہ چاروں خلطے اگر اعتدال کے ساتھ رہیں، تو صحت قائم رہتی ہے، تندرستی بنی رہتی ہے، اگر اِن میں کمی بیشی ہو جائے تو جسم میں بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور صحت بگڑ جاتی ہے، بعض مرتبہ خواب میں کچھ چیزیں نظر آتی ہیں وہ رؤیائے صالحہ نہیں ہوتا، بلکہ کسی خِلطہ کے غلبہ کا اثر ہوتا ہے، چنانچہ اگر جسم میں سوداء کا غلبہ ہو جائے تو خواب میں زیادہ تر کالی چیزیں نظر آتی ہیں، اگر پیٹ میں رطوبتیں زیادہ ہو جائیں تو بہت سی مرتبہ انسان خواب میں اپنے آپ کو اُڑتا ہوا دیکھتا ہے، اِس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں، لیکن یہ رؤیائے صالحہ نہیں۔

خواب میں اپنے آپ کو اڑتا ہوا دیکھنا:

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہیؒ نے سنایا تھا کہ ایک صاحب نے حضرت رائپوریؒ سے عرض کیا کہ حضرت! میں خواب میں اپنے آپ کو اُڑتا ہوا دیکھتا ہوں، اِس کی کیا تعبیر ہے؟ حضرت خاموش رہے، اُس نے پھر کہا کہ حضرت! میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں اوپر اُڑ رہا ہوں، حضرت پھر بھی خاموش رہے توجہ نہیں فرمائی، اُس نے پھر تیسری مرتبہ کہا، اُس نے سوچا کہ یہ بہت بڑے کمال کی چیز ہوگی، تو پھر حضرت نے فرمایا کہ: اَرے بھائی! اِسے اسبغول پلاؤ، یہ خواب واب سب صحیح ہو جائیں گے۔ تو یہ رؤیائے صالحہ

نہیں، اُس کی صورت الگ ہوتی ہے۔

عالمِ مثال:

حضرت فرماتے تھے کہ ایک عالم ،عالمِ مثال ہے ،رؤیائے صالحہ کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ صالح اور سچے بندے کی روح خواب میں عالمِ مثال کی بعض چیزوں کو دیکھتی ہے، جیسے علم ،عالمِ مثال میں دودھ کی شکل میں ہے، پس اگر خواب میں اپنے آپ کو دیکھا کہ دودھ پیا ہے، تو اُس کی تعبیر یہ ہے کہ علم حاصل ہوگا، اخلاقِ رذیلہ عالمِ مثال میں موذی جانوروں کی شکل میں ہیں، پس خواب میں اگر موذی جانور کو دیکھا، تو اپنے اخلاق درست کرنے کی فکر کرنی چاہئے ، بعض مرتبہ خواب میں سانپ نظر آتا ہے، اُس سے مراد بعض مرتبہ وہ مال ہوتا ہے ، جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو ، البتہ زیادہ تر اِس سے اخلاقِ رذیلہ ہی مراد ہوتے ہیں۔

خواب کی تعبیر کا ماہر کون ہوتا ہے؟

خواب کی تعبیر کے لئے کوئی مقررہ ضابطہ نہیں ہے، جو شخص ذی بصیرت عالم ہو، اور خواب دیکھنے والے کے احوال سے واقف ہو وہ قرائن سے پہچان لیتا ہے، کہ یہ خواب اقسامِ ثلٰثہ میں سے کون سی قسم کا ہے ،اور اِس خواب کا کون سا جز مقصود ہے، اِسی لئے بسا اوقات کئی لوگ ایک طرح کا خواب دیکھتے ہیں، لیکن ہر ایک کے حق میں تعبیر جدا جدا ہوتی ہے، حضرت اقدس مفتی صاحبؒ فرماتے تھے کہ جس شخص کو عالمِ مثال سے زیادہ مناسبت ہوتی ہے، وہ تعبیر کا ماہر ہوتا ہے اور صحیح تعبیر دیتا ہے۔

حضرت فقیہ الامت رحمہ اللہ کی تعبیر الرؤیا میں مہارت:

ہم نے اِفتاء کے سال نصابِ اِفتاء کی مشہور کتاب "الاشباہ والنظائر" حضرت اقدس مفتی صاحب رحمہ اللہ سے پڑھی، حضرت رحمہ اللہ دورانِ درس بہت سی علمی واصلاحی باتیں سناتے تھے، تعبیرِ رؤیا پر کلام کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا: "کہ احوال اور اشخاص کے اعتبار سے تعبیر مختلف ہوتی ہے، تعبیرِ رؤیا کی جو کتابیں کتب خانوں میں دستیاب ہیں، اُن کو دیکھ کر تعبیر نہیں دینی چاہئے"۔

اِسی پر حضرت نے یہ بھی سنایا کہ ایک صاحب نے مجھ سے خواب بیان کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی والدہ سے بدکاری کر رہا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ میں نے اُسے تعبیر دی کہ غیبت سے احتراز کرو، غیبت کو ماں کے ساتھ زنا سے بھی سخت بتایا گیا ہے، ایک اور صاحب نے بھی اپنا یہی خواب بیان کیا، اُس نے کہا کہ میں نے یہ دیکھا کہ اپنی والدہ سے بدکاری کر رہا ہوں، حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا: کہ میں نے اُسے تعبیر دی کہ تمہارے کاروبار میں سود کی کچھ آمیزش معلوم ہوتی ہے، سود سے بچو، اُس نے اقرار کیا کہ ہاں ایسا تو ہے، یہ تعبیر اِس لئے دی کہ حدیث میں سود کا ایک درہم چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت قرار دیا گیا ہے، پھر فرمایا کہ ایک اور صاحب نے یہی خواب دیکھا، اور مجھ سے بیان کیا، وہ اُس خواب کی وجہ سے بہت پریشان بھی تھے، میں نے اُن کو تعبیر دی کہ انشاء اللہ تم حج کروگے، اِس تعبیر کی وجہ حضرت نے یہ بتائی کہ ماں کو عربی زبان میں اُمّ کہا جاتا ہے، اور مکہ مکرمہ کا ایک نام "اُمُّ القُریٰ" ہے، قرآنِ کریم میں بھی یہ نام آیا ہے، اور وطی کے معنی روندنے اور چلنے کے ہیں، اور وہاں جانا اور چلنا اصلاً حج کے لئے ہوتا ہے۔ فرمایا کہ ایک اور صاحب نے یہی خواب دیکھا، تو میں نے تعبیر دی کہ انشاء اللہ

تمہیں اپنی والدہ سے نفع پہنچے گا۔

رؤیائے صالحہ ذریعۂ معرفت وانکشاف:

تعبیر الرؤیا کی بحث ضمناً آگئی، کلام اِس پر ہو رہا تھا، کہ سچے شخص کو رؤیائے صالحہ نظر آتے ہیں، کئی احادیث میں رؤیائے صالحہ کو جزءِ نبوت قرار دیا گیا ہے، حضرت انسؓ نے حضور اکرم ﷺ سے نقل کیا ہے:

«اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِیْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ»۔

(مشکوٰۃ کتاب الرؤیا فصلِ اول ص ۳۹۴ بحوالہ بخاری و مسلم)

کہ رؤیائے صالحہ نبوت کا چھیالیسواں جز ہے۔

بخاری شریف میں ہی یہ بھی روایت ہے:

«لَمْ یَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ ،وَزَادَ مَالِكٌ، یُرَاهَا الرَّجُلَ الْمُسْلِمُ»۔ (مشکوٰۃ ص ۳۹۴ بحوالہ بخاری)

یعنی آن حضرت ﷺ کے بعد علمِ نبوت میں سے محض مبشرات باقی رہیں گے، صحابہؓ نے معلوم کیا کہ مبشرات کیا چیز ہیں، فرمایا کہ رؤیائے صالحہ۔

کتبِ حدیث میں اِس نوع کی اور بھی بہت روایات ہیں، سب کا ماحصل یہ ہے کہ مومن کا خواب علمِ نبوت کے اجزاء، اور اُس کے آثار میں سے ہے، جس سے بعض آئندہ پیش آنے والے امور کا کچھ پتہ چلتا ہے اور اُن کا انکشاف ہوتا ہے ،اِس سے مومن کو بعض امور میں رہنمائی مل کر تسلی حاصل ہوتی ہے، خواب اگرچہ حجتِ شرعیہ نہیں مگر رہنمائی کا ذریعہ ضرور ہے، کیونکہ بمقتضائے حدیث وہ بھی غیبی فیضان ہے۔

صدق کی برکت سے علوم ومعارف کا فیضان:

رؤیائے صالحہ جو غیبی فیضان اور ذریعۂ انکشاف ہے، اس کا مدار جیسا کہ ترمذی کی حدیث سے، اور امامِ غزالیؒ کے کلام سے معلوم ہوا، صدقِ لسان پر ہے، صدق کے اہتمام سے قلب میں خشیت پیدا ہوتی ہے، اور زندگی میں تقویٰ آتا ہے، پھر صدق، خشیت، اور تقویٰ سے قلب میں جیسے جیسے جِلاء و صفائی آتی ہے، اُسی کے بقدر اُس قلب میں اللہ کی معرفت اور اُس کی تجلّی کی قابلیت بڑھتی رہتی ہے پھر اُس قلب پر منامات و الہامات کے ذریعہ علوم ومعارف کا فیضان ہونے لگتا ہے، قلب پر ایسے نِکات وارد ہوتے ہیں، جن کو کتابوں میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے ایک موقع پر بیان کیا کہ شئ کے تین مرتبے ہیں ،لا بشرطِ شئ، بشرطِ لا شئ، بشرطِ شئ، کسی نے دریافت کیا کہ حضرت! یہ تو منطق کے اصطلاحی (اونچے) الفاظ ہیں آپ کو یہ کیسے معلوم ہوئے (کیونکہ حضرت حاجی صاحبؒ کا عالمیت کا مکمل کورس نہیں ہوا تھا) تو ارشاد فرمایا کہ (ہمارے قلب پر) جس طرح معانی کا اِلقاء ہوتا ہے، الفاظ کا بھی ہوتا ہے۔ (ملفوظات فقیہ الامت ج۳ ص ۱۹۰)

حضرت سہارنپوریؒ کو اگر کوئی شبہ پیش آتا، اُس کو حضرت گنگوہیؒ سے معلوم فرماتے، ایک مرتبہ حضرت سہارنپوریؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو لکھا کہ حق تعالیٰ کے ارشاد: ﴿قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ﴾ (البقرہ: ۱۱۶) میں ”اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا“ مشرکین کا مقولہ ہے، اور ”سُبْحَانَهٗ“ حق تعالیٰ کا مقولہ ہے جس سے مشرکین کے مقولہ کی تردید کی گئی ہے، لہٰذا درمیان

میں وقف لازم ہونا چاہئے ، مگر قرآنِ پاک میں وقف لازم نہیں لکھا، حضرت اقدس گنگوہیؒ نے جواب دیا: کہ "اِتَّخَذَ اللهُ وَلَدًا" مشرکین کا ایسا مقولہ ہے جس کی تردید بلا وقف لازم ہے، اگر وقف کیا جاتا تو شبہ ہوتا کہ شاید مشرکین کے اِس مقولہ میں جان ہے، اِس لئے جیسے ہی اُن کی زبان سے یہ لفظ نکلا فوراً اُس کی تردید کی گئی "سُبْحَانَه" (کہ اس کی ذات اولاد و غیرہ نقائص سے پاک ہے)۔ (ملفوظات فقیہ الامت ج۱ ص۱۱۳)

وضو میں سنن کی فرائض پر تقدیم کی حکمت:

ہمارے حضرتؒ نے ہی سنایا تھا، کہ ایک مولانا صاحب پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے جب آدمی نیا نیا عالم بنتا ہے، تو طبیعت میں ایک جوش ہوتا ہے، عُجب ہوتا ہے، اُن کے علاقہ میں ایک بزرگ تھے، پڑھے لکھے نہیں تھے، اُن کے بارے میں سوچا کہ وہ بزرگ تو ہیں، اور ان کے بہت مریدین بھی ہیں، لیکن پڑھے لکھے تو نہیں ہیں، نہ حافظ ہیں، نہ عالم، اور اگر ہدایہ کا کوئی مسئلہ پوچھ لیا تو بغل جھانکتے رہ جائیں گے، یہ خیال آیا اور اِسی خیال کو لے کر اُن بزرگ کے پاس گئے، وہاں اُن کی مجلس لگی ہوئی تھی، کہا کہ حضرت! ایک سُوال ہے، آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں، اُنہوں نے فرمایا کہ کیا سُوال ہے بتاؤ؟ اُن عالم صاحب نے کہا کہ حضرت! سُوال یہ ہے کہ وضو میں تین سنتیں ہیں، دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک دھونا، کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، اور چہرہ دھونا، دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونا، سر کا مسح کرنا، اور دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھونا فرض ہے، تو اِس میں یہ معلوم کرنا ہے کہ فرض کا درجہ تو سنتوں سے بڑھا ہوا ہے، نیز سنتیں فرائض کی تکمیل کے لئے ہوتی ہیں، اِس لئے وضو

کی ابتداء فرائض سے ہونی چاہئے نہ کہ سنتوں سے، لیکن شریعت میں حکم یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک دھوؤ پھر کلی کرو، پھر ناک میں پانی ڈالو، اِن سنتوں کو ادا کرنے کے بعد وضو کے فرائض ادا کئے جائیں، ایسا کیوں ہے؟

اُن بزرگ نے برابر میں بیٹھے ہوئے اپنے ایک خادم (جو کم عمر کا لڑکا تھا) کی طرف اِشارہ کرکے کہا کہ اِس سے پوچھ لو، اُن عالم صاحب کو کچھ سُبکی محسوس ہوئی، کہ میں نے اِتنا اہم سوال کیا ہے، لیکن میرے سوال پر توجہ نہیں دے رہے ہیں، اِس لڑکے کے بارے میں کہہ رہے ہیں، کہ اِس سے پوچھ لو، حضرت نے فرمایا: کہ بھائی پوچھ لو علم کی بات میں شرمانا نہیں چاہئے، خیر پوچھا تو اُس لڑکے نے جواب دینا شروع کیا، وہ لڑکا بھی نہ حافظ تھا، نہ عالم، اُس نے کہا کہ دیکھئے مولانا صاحب!

پانی کے تین اَوصاف ہیں ،رنگ ،بو، اور مزہ، پانی کے یہ تینوں اَوصاف، صحیح ہیں یا نہیں ہیں، ہمیں نہیں معلوم ،اِس لئے شریعت نے حکم دیا کہ وضو میں اولاً دونوں ہاتھوں کو گٹوں تک دھویا جائے ، پانی کو جب ہاتھوں پر ڈالیں گے تو نظر آجائے گا کہ اُس کا رنگ صحیح ہے یا نہیں، نَجاست اور گندگی کی وجہ سے اُس کا رنگ بدلا ہوا تو نہیں ہے، اِس کے بعد شریعت نے حکم دیا کہ اب کلی کیجئے، کلی کرنے سے ذائقہ معلوم ہو جائیگا کہ اُس کا ذائقہ صحیح ہے یا نہیں؟ کسی نجاست کے گرنے کی وجہ سے اُس کا ذائقہ بدلا ہوا تو نہیں ہے ،پھر شریعت نے حکم دیا کہ پانی ناک میں ڈالیں، تیسری سنت ادا کریں ،ناک میں پانی ڈالنے سے بوٗ معلوم ہو جائیگی، کہ اُس کی بو صحیح ہے یا نہیں ،جب پتہ چل گیا کہ اُس کے تینوں اَوصاف

صحیح ہیں، تو معلوم ہو گیا کہ یہ پانی ''عَلٰی صِفَۃِ الْمُنَزَّلِ مِنَ السَّمَآءِ''
ہے، جس کو طہور قرار دیا گیا ہے، اب یہ اِس قابل ہے کہ اِس کے ذریعہ فریضۂ وضو ادا کیا جائے، جو نماز کی صحت کے لئے شرط ہے۔

اِس جواب سے وہ عالم صاحب حیرت میں رہ گئے، جنہوں نے اِس نیت سے سُوال کیا تھا کہ پیر صاحب جواب نہیں دے پائیں گے، وہ سوچنے لگے کہ یہ جواب تو ہم نے کتابوں میں بھی نہیں پڑھا، اِس کے بعد وہ بزرگ اِستنجاء کے لئے چلے گئے، تو اُن عالم صاحب نے اُس لڑکے سے کہا، کہ جو تقریر تم نے کی تھی وہ مجھے لکھوادو اُس نے کہا کہ میں نے تو کوئی تقریر نہیں کی، اور میں تقریر جانتا بھی نہیں۔

بات اصل یہ ہے کہ اُس لڑکے کی صرف زبان تھی، اصل فیض اُن بزرگ کے ذریعہ ہو رہا تھا، لڑکا صرف ترجمانی کر رہا تھا، اِس لئے بعد میں اُسے کچھ یاد نہیں رہا، آدمی صدق کا اہتمام کرتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اس پر علوم و معارف کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

نورِ معرفت کے ذریعہ قرآن وحدیث کے کلمات کی شناخت :

ایک بزرگ تھے، پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن وہ بتادیا کرتے تھے، کہ یہ قرآن کی آیت ہے، یا حدیث ہے، علماء اُن کا امتحان لیتے، قرآن کی آیت اُن کے سامنے پڑھتے، تو بتادیتے کہ یہ قرآن کی آیت ہے، حدیث کا کوئی جملہ اُن کے سامنے پیش کیا جاتا، تو وہ بتادیتے کہ یہ حدیث ہے، بعض مرتبہ علماء اُن کے امتحان کے لئے ایسا کرتے کہ کچھ حصہ لیتے آیت کا، اور اُس میں کچھ حصہ ملادیتے حدیث شریف کا، اور دونوں کو ملا کر اُن کے سامنے پڑھتے، تو وہ

فرماتے کہ اتنا حصہ قرآن ہے، اور اتنا حصہ حدیث ہے، اُن سے معلوم کیا گیا کہ آپ نے کچھ پڑھا نہیں ہے، قرآن بھی نہیں پڑھا، حدیث بھی نہیں پڑھی، پھر آپ کو کیسے پتہ چل جاتا ہے، کہ یہ قرآن ہے اور یہ حدیث ہے ، فرمایا کہ قرآن کا نور الگ ہے، اور حدیث کا نور الگ ہے، وہ نور مجھے نظر آتا ہے، اُس نور سے پہچان لیتا ہوں کہ یہ قرآن کی آیت ہے اور یہ حدیث ہے، اور جب دونوں کو ملایا جاتا ہے، تو جتنے حصے پر قرآن کا نور نظر آتا ہے، اُس کے لئے میں بتاتا ہوں کہ یہ قرآن ہے، اور جتنے حصے پر حدیث کا نور نظر آتا ہے، تو بتاتا ہوں کی یہ حدیث ہے، بعض سَر پھرے، ایسا کرتے کہ قرآن اور حدیث سے الگ، عربی کا کوئی جملہ پیش کر کے معلوم کرتے کہ یہ قرآن ہے یا حدیث؟ وہ بتا دیتے کہ یہ نہ قرآن ہے نہ حدیث، اُس کے متعلق یہ فرماتے کہ جس کلام پر نہ قرآن کا نور نظر آتا ہے، نہ حدیث کا، تو پہچان لیتا ہوں کہ یہ نہ قرآن ہے نہ حدیث ہے، جب قلب میں جِلاء آجاتا ہے، تو دل کی آنکھوں سے یہ چیزیں نظر آتی ہیں۔

صدق کے چار درجوں میں سے دوسرے درجہ صدق فی اللسان پر یہ کلام ہوا ، یہ درجہ بہت اہم ہے ، کیونکہ زبان کی سچائی سے قلب میں اِستقامت آتی ہے، کجی ختم ہوتی ہے، اور اُسی سے قلب میں روحانی ترقیات کی استعداد پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن وحدیث کی نصوص سے اور اہل اللہ کے واقعات سے یہ چیز بخوبی واضح ہوگئی۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجلس(۳)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی وَسَلَّمَ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ. اَمَّا بَعۡدُ

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

صدق کا تیسرا درجہ صدق فی الافعال:

حضرت شیخ یونس جون پوریؒ کے بیان کئے ہوئے صدق کے چار درجات میں سے دو کی تشریح ذکر کی جاچکی ہے، حضرتؒ کا بیان کیاہوا صدق کا تیسرا درجہ "صدق فی الافعال ہے" یعنی بندے کا فعل بھی سچاہو، افعال دو قسم کے ہیں:

ایک وہ جو اللہ کی مخلوق سے متعلق ہیں، بالخصوص وہ افعال جن کے ذریعہ رشتہ داروں، پڑوسیوں، احباب، اور دوستوں سے سابقہ پڑتا ہے مثلاً اُن کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا، اُنکی خوشی میں شریک ہونا، اُن کی دعوت کرنا یا اُن کی دعوت قبول کرنا، ہدیہ وتحفہ لینا اور دینا وغیرہ اموروافعال، یہ افعال اُخُوّت ومحبت، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے سے کئے جاتے ہیں، اِنہیں مقاصد کے لئے اِن افعال کو وضع بھی کیا گیاہے، لہٰذا جو شخص اِن اَفعال کو ہمدردی وخیر خواہی کی نیت سے انجام دے ،وہ اِن افعال میں سچا ہے ، اور اگر

طمع، لالچ، خود غرضی، اور سیاسی مقاصد کے تحت اِن اَفعال کو اِختیار کرے، تو یہ فعل کا کذب ہے، گویا اپنے عمل سے سامنے والے کو فریب اور دھوکا دیا گیا ہے۔

دوسری قسم کے افعال وہ ہیں، جو عبادت اور طاعت کی قبیل سے ہیں، جن کو اللہ کی رضا کے لئے وضع کیا گیا ہے، اُن میں صدق کے معنی بالکل واضح ہیں، وہ یہ کہ اُن کو محض اللہ کی ذات اور اُس کی رضا کے لئے کیا جائے، بالفاظِ دیگر اخلاص سے کیا جائے، اخلاص کے کمال کو صدق کہا جاتا ہے، امام غزالی نے اس کی صراحت فرمائی ہے۔

اخلاص کا رکن:

صدق فی الفعل یعنی فعل میں اخلاص کا بنیادی رکن ہے: ''نیتِ صحیحہ'' یعنی عمل سے اللہ کی ذات مقصود ہو اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش نہ ہو، حق تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾
(الانعام: ۵۲)

یعنی اپنے پاس سے اُن کو علیٰحدہ نہ کرو، جو صبح وشام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں، دراں حالیکہ اُسی کی ذات کو چاہتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا گیا:

﴿وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (البینۃ: ۵)

یعنی لوگوں کو اسی کا حکم دیا گیا کہ وہ دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے عبادت کریں۔

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ عمل سے حق تعالیٰ کی ذات اور اُس کی رضا

مقصود ہو، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ:

اعمال کا مدار نیت پر ہے، کچھ لوگوں کے صحیفۂ اعمال حق تعالٰی کے حضور میں پیش ہونگے، حق تعالٰی فرمائے گا کہ اِن کو پھینک دو، کیونکہ اِن اعمال سے اُس شخص کو میری ذات مقصود نہ تھی، اور کچھ بندوں کا نامۂ اعمال پیش ہو گا، تو حکم ہو گا کہ فلاں فلاں عمل اور درج کر دو، فرشتے عرض کریں گے کہ بارِ الٰہا! وہ اعمال تو اُس نے کئے ہی نہیں تھے، حکم ہو گا کہ اِن اعمال کی اُس نے نیت تو کی تھی، اور اُس کا ہم کو علم ہے۔ (تبلیغِ دین: ص۲۷۵)

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا قصہ ہے، کہ قحط سالی کے زمانے میں ریت کے ٹیلے پر اُس کا گذر ہوا، اور وہ اپنے دل میں کہنے لگا، کہ یہ ریت کا ٹیلہ اگر اناج بن جائے، تو میں اس کو لوگوں میں تقسیم کر دوں، اللہ تعالٰی نے اُس زمانے کے نبی پر وحی بھیجی کہ اُس شخص سے کہدو کہ خدا نے تمہاری خیرات قبول کی، اور نیک نیتی کی قدر فرمائی، اور اُسی قدر ثواب عطا کیا، جتنا ٹیلہ کی مقدار اناج کے مساکین پر خیرات کر دینے میں ملتا۔ (تبلیغِ دین: ص۲۷۶)

صدق واخلاص والا عمل ہی ذریعۂ نجات ہے:

جس عمل میں صدق واخلاص ہو، اور نیت میں اخلاص کے منافی کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، وہ آخرت میں وزنی ثابت ہو گا اور ایسا ہی عمل نجات کا ذریعہ بنے گا، اگر نیت میں ریاء ونمود ہے، یا اور کوئی غرضِ فاسد شامل ہے تو وہ عمل آخرت میں بے وزن ہو گا، بلکہ وبالِ جان بن جائیگا۔

ریاکار مجاہد

چنانچہ روایت میں آتا ہے، کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس ایک شخص

آئے اور کہا کہ آپ نے کوئی روایت حضور اکرم ﷺ سے سنی ہو، تو وہ بتلایئے، حضرت ابو ہریرہ ایک حدیث سنانے کے لئے تیار ہوئے، تو اُس کے مضمون سے فکر مند ہو کر بے ہوش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد اِفاقہ ہوا، پھر اُس روایت کو بیان کرنا چاہا، لیکن پھر بے ہوش ہو گئے، تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا، اُس کے بعد وہ مشہور روایت سنائی کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قیامت کے دن جن تین اشخاص کا سب سے پہلے حساب ہو گا، ان میں سے ایک شخص وہ ہو گا، جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس سے پوچھے گا، کہ میں نے تجھے نعمتِ بدن دی تھی، تو نے اُس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ کہے گا یا اللہ! میں نے تیرے راستہ میں جہاد کیا، ''حَتّٰی اُسْتُشْهِدتُّ'' یہاں تک کہ میں تیرے راستہ میں شہید ہو گیا، اللہ فرمائے گا: تو نے غلط کہا، یہ سب کچھ تو نے اِس لئے کیا تاکہ تجھے شُجاع کہا جائے، بہادر کہا جائے، تیری نیت ہماری رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی نہیں تھی، دنیا کی شہرت اور ناموری کے مقصد سے تو نے یہ سب کیا، تیرا وہ مقصد پورا ہو گیا، چنانچہ دنیا میں تجھے شجاع و بہادر کہا جا چکا، اب تیرے لئے یہاں کچھ نہیں ہے، چنانچہ ملائکہ کو حکم دیا جائیگا کہ اُسے منہ کے بَل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے۔

ریاکار سخی:

ایک شخص کو بلایا جائیگا اور فرمایا جائیگا: کہ ہم نے تجھے مال کی نعمت دی تھی، اُس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ کہے گا یا اللہ! خیر کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا جہاں پر میں نے خرچ نہ کیا ہو، اللہ کہے گا کہ تو نے یہ سب اِس لئے کیا، تاکہ تجھے جوّاد

کہا جائے سخی کہا جائے، سو وہ کہا جا چکا، یہاں تیرے لئے کچھ نہیں ہے، اُسے بھی منہ کے بَل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔

ریاکار عالم:

ایک عالم کو بلایا جائیگا، اللہ جل شانہ فرمائیگا، ہم نے تجھے علم کی نعمت دی تھی، تونے اُس کا کیا حق ادا کیا؟ تو وہ کہے گا، یا اللہ میں نے خود بھی علم حاصل کیا، دوسروں کو بھی سکھایا، میں نے دین کی فلاں خدمت کی، فلاں علمی کام کیا اور قرآن بھی پڑھا، اللہ جل شانہ فرمائیگا، یہ سب تونے اِس لئے کیا، تاکہ تجھے عالم کہا جائے، سو وہ دنیا میں کہا جا چکا، قرآن اِس لئے پڑھا، تاکہ قاری کہا جائے، وہ بھی کہا جا چکا، اُسے بھی منہ کے بَل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائیگا۔
(مشکوٰۃ کتاب العلم فصلِ اول ص ۳۳)

تحصیلِ علم میں فسادِ نیت پر وعید:

ایک حدیث میں حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

«مَنْ طَلَبَ الْعِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ الْعُلَمَآءَ، اَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَآءَ، اَوْيُصْرِفَ بِهِ وُجُوْهَ النَّاسِ اِلَيْهِ، اَدْخَلَهُ اللّٰهُ النَّارَ» (مشکوٰۃ کتاب العلم فصلِ ثانی ص ۳۴)

یعنی جو شخص علم اِس لئے حاصل کرے، تاکہ علماء سے مقابلہ آرائی کرے، یا جاہلوں سے بحثیں کرے، یا اِس لئے علم حاصل کرتا ہے تاکہ لوگوں کے چہروں کو اپنی طرف متوجہ کرے، یعنی نیت یہ ہو کہ لوگ مجھے بڑا عالم کہیں، میری عزت کریں، میرا دنیا میں نام پیدا ہو جائے، تو ایسا شخص جہنم میں داخل ہو گا، کیونکہ یہ نیتیں اخلاص کے مُنافی ہیں۔

غور کیجئے کہ اُس نے علم حاصل کیا، محنت کی، اپنی زندگی کا قیمتی وقت بھی صرف کیا، لیکن نیت میں فساد تھا، تو یہ علم اُس کے لئے وبالِ جان بن جائیگا۔

دنیامیں بھی نصرتِ خداوندی اخلاص پر موقوف:

اللہ کی نصرت اور مدد دنیامیں بھی اُسی عمل پر آتی ہے، جس میں صدق پایا جائے، اخلاص پایا جائے، بخاری شریف میں روایت ہے، حضور اکرم ﷺ نے پہلی امتوں کا ایک واقعہ بیان فرمایا:

تین شخص چلے جارہے تھے، تیز بارش آئی، قریب ہی میں ایک پہاڑ تھا، اُس میں غار تھی، بارش طوفانی شکل میں تھی، اُس سے بچنے کے لئے یہ تینوں اُس غار کے اندر داخل ہوگئے، وہاں پتھر کی ایک بڑی چٹان تھی، جو غار کے دہانے پر آکر گری، جس کی وجہ سے وہ غار کے اندر بند ہوگئے، اب نہ ہوا آنے کا کوئی راستہ ہے، نہ روشنی حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے، یہ تینوں نہایت پریشان ہوگئے، وہاں کوئی آبادی بھی نہ تھی، دور دور تک لوگ بھی نہ تھے کہ کوئی اُن کی مدد کرسکے، بالکل بے سہارا ہوگئے، اُنہیں اپنی ہلاکت نظر آنے لگی، تینوں نے آپس میں کہا، کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے اعمال میں غور کرے کہ کون سا عمل، محض اللہ کی رضا کے لئے کیا ہے، اُس عمل کی برکت سے اللہ سے دعا مانگے، جب ہی ہمیں نجات حاصل ہوسکتی ہے۔

والدین کی پُرخلوص خدمت کا ثمرہ:

چنانچہ اُن میں سے ایک شخص نے اللہ کی بارگاہ میں دعا شروع کی، اور اپنا ایک عمل ذکر کیا، یا اللہ! میرا عمل یہ تھا کہ میں بکریاں چراتا تھا، میں

شام کو بکریاں واپس لاتا، اُن کا دودھ نکالتا، وہ دودھ پہلے والدین کو پلاتا، پھر اپنے بچوں کو پلاتا، ایک روز ایسا ہوا، کہ بکریوں کو چراتے میں بہت دور نکل گیا، واپس آنے میں دیر ہوگئی، گھر پہنچا دودھ نکالا، اور دودھ لے کر والدین کے پاس پہنچا تو وہ سو چکے تھے، میں دودھ لے کر اُن کے پاس کھڑا رہا، کہ جیسے ہی بیدار ہوں، اُن کو دودھ پلا دوں، میرے بچے روتے رہے، دودھ مانگتے رہے، لیکن میں نے اِس بنا پر کہ والدین کا حق مقدم ہے بچوں کو دودھ نہیں پلایا۔

پچھلی شریعتوں میں والدین کا حق اہل وعیال پر مقدم تھا:

ہماری شریعت میں تو مسئلہ کی ترتیب دوسری ہے، کہ انسان کے ذمہ میں پہلے اپنا نفقہ ہے، اُس کے بعد اہل وعیال کا اور پھر والدین کا ہے، لیکن اُس شریعت میں جس شریعت کا حضور اکرم ﷺ نے واقعہ بیان فرمایا، والدین کا حق بچوں پر مقدم تھا، شُرّاحِ حدیث نے یہ بات لکھی ہے، اِس لئے اشکال نہیں ہوگا۔

تو اُس شخص نے کہا، یا اللہ میں دودھ لیکر والدین کے پاس کھڑا رہا، اور بچے میرے پاس کھڑے رو رہے تھے، دودھ مانگ رہے تھے، لیکن میں والدین کو دودھ پلانے کے انتظار میں کھڑا رہا، حتیٰ کہ فجر طلوع ہوگئی، صبح ہوگئی، اُس وقت والدین بیدار ہوئے میں نے اُن کو دودھ پلایا، یا اللہ یہ عمل اگر میں نے صدق کے ساتھ کیا ہے، اخلاص کے ساتھ کیا ہے، تجھے راضی کرنے کے لئے کیا ہے، تو اِس عمل کی برکت سے اِس چٹان کو اتنا ہٹا دے کہ ہمیں آسمان نظر آنے لگے، حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ وہ چٹان تھوڑی سی ہٹ گئی

جس سے اُنہیں آسمان نظر آنے لگا، ہَوا اور روشنی آنے لگی۔

تنہائی میں خوفِ خدا کا بدلہ:

دوسرے ساتھی نے اپنا عمل ذکر کیا، کہ یا اللہ میری ایک چچازاد بہن تھی، بہت حسین اور خوبصورت تھی، میں اُس سے محبت کرتا تھا، اُس سے عشق تھا، جتنی محبت کسی مرد کو کسی عورت سے ہو سکتی ہے، اتنی محبت بلکہ اُس سے کہیں زیادہ محبت تھی، اُس چچازاد بہن سے میں نے ایک روز اپنی جنسی خواہش پوری کرنے کا مطالبہ کیا، اُس نے کہا کہ یہ کام اُس وقت ہو سکتا ہے، جب کہ تم سو دینار میرے حوالہ کرو، اُس شخص نے کہا کہ یا اللہ میں نے محنت مزدوری کی، اور سو دینار حاصل کئے، سو دینار لے کر اُس کے پاس حاضر ہوا، وہ میرا مقصد پورا کرنے پر آمادہ ہو گئی، چنانچہ میں اُس سے ہمبستری کرنے کے لئے اُس کے اوپر بیٹھ گیا، عین موقع پر اُس نے کہا: ”یَا عَبْدَ اللهِ! اِتَّقِ اللهَ“ اے اللہ کے بندے، اللہ سے ڈر، اور اِس کام سے باز آ، چنانچہ میں فوراً اُس سے جُدا ہو گیا، الگ ہو گیا، میں نے اپنے نفس کے تقاضے کو دبایا، اپنے جذبات کو قربان کیا، اور اُس عورت کو چھوڑ دیا، اے اللہ یہ عمل اگر میں نے تجھے راضی کرنے کے لئے کیا ہے اخلاص کے ساتھ کیا ہے، تو اِس چٹان کو تھوڑا سا اور ہٹا دے، فرمایا حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اللہ نے چٹان کو تھوڑا سا اور کِھسکا دیا۔

تجارت میں امانت داری کا صلہ:

تیسرے شخص نے اللہ کی بارگاہ میں اپنا عمل عرض کیا، کہ یا اللہ میں نے اپنے کام کاج کے لئے ایک اجیر (نوکر) رکھا، اُس نے محنت سے دن بھر کام

کیا، اُجرت ایک فَرَق ''جو'' طے ہوئی تھی، کلو گرام کے حساب سے یہ چند کلو ''جو'' ہوں گے، جب شام ہوئی، میں نے اُس سے کہا کہ بھائی تو نے محنت سے کام کیا، کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی، اِس لئے اپنی مقررہ اجرت لے لے، اُس نے اجرت لینے سے انکار کر دیا اور چلا گیا، میں نے اُس کی اجرت جو چند کلو ''جو'' تھے، اُن کے ذریعہ کھیت میں کاشت کی اُس سے جو پیداوار ہوئی، اُس کو پھر کاشت میں لگایا، جس سے کافی غلہ جمع ہو گیا، پھر اُس غلہ سے اُسی شخص کی نیت سے کچھ جانور خرید لئے، گائیں خریدیں، بکریاں خریدیں، حتی کہ جانوروں کا ایک ریوڑ بن گیا، اور غلہ بھی جمع ہو گیا، میں نے اُس ریوڑ کو اور غلہ کو محفوظ رکھا، حتی کہ کافی وقت گذر گیا، ایک عرصہ کے بعد وہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ بھائی! میری اجرت تیرے پاس رہ گئی تھی، وہ مجھے دیدے، میں نے وہ سارا غلہ اور ریوڑ کے تمام جانور اُس کے حوالہ کرنا چاہا، کہ یہ ہے تمہاری اجرت، اِس کو لے جا، اُس نے کہا میرے ساتھ مذاق نہ کر، وہ تو چند کلو ''جو'' تھے، مجھے وہ دیدے، میں نے کہا کہ اُن ''جو'' کے ذریعہ سے میں نے کاشت کی، اور تمہاری آمدنی کو بڑھاتا رہا، حتی کہ وہ آمدنی اِس قدر ہو گئی جو تم دیکھ رہے ہو، اِس لئے اِن سب کو لے جاؤ، وہ شخص اُس غلہ کو اور اُن جانوروں کو لے کر چلا گیا۔

یا اللہ! یہ عمل اگر میں نے تیری رضا کے لئے کیا ہو، اخلاص کے ساتھ کیا ہو تو اس چٹان کو اتنا ہٹا دے کہ ہم سب اِس غار سے نکل جائیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ شانہ نے چٹان کو اِس قدر ہٹا دیا کہ وہ تینوں غار سے نکل گئے، اور مصیبت سے نجات پا گئے۔ (مشکوٰۃ، باب البر والصلۃ، فصلِ ثالث ص ۴۲۰ بحوالہ بخاری شریف)

حدیث کے اِس واقعہ سے ثابت ہوا، کہ اخلاص وللٰہیت پر اللہ کی مدد ونصرت نازل ہوتی ہے، اور اخلاص والے اعمال کی برکت سے مصائب وآلام سے خَلاصی حاصل ہوتی ہے، اور اللہ کی رحمت متوجہ ہوتی ہے، اِس کے برعکس ریا ونمود کے جذبہ سے کیا ہوا عمل اللہ کی ناراضگی کا ذریعہ، اور بسا اوقات آفات وبلیات میں اِبتلاء کا سبب ہو جاتا ہے۔

مخلص بندے اغواءِ شیطانی سے محفوظ:

اگر دل میں جذبۂ اخلاص ہو تو ایسا شخص شیطان کے اغواء اور بہکاوے سے محفوظ رہتا ہے، اوراس پر شیطانی ہتھکنڈے اثر انداز نہیں ہوتے، شیطان کے اس کو ورغلانے اور راہِ راست سے منحرف کرنے کی تمام کوششیں ضائع اور رائگاں ہو جاتی ہیں۔

شیطان کو جب راندۂ درگاہ کیا گیا، تو اُس نے حق تعالیٰ شانہ کے سامنے دعویٰ کیا:

﴿لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ (الحجر:۳۹)

جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی وجہ سے مجھے راندۂ درگاہ کیا گیا، اِس لئے میں اُس کو گمراہ کروں گا، راہ راست سے ہٹاؤں گا، اُس کو تیرا نافرمان بناؤں گا، البتہ شیطان نے استثناء کیا:

﴿اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ﴾ (الحجر:۳۹)

کہ جو تیرے مخلص بندے ہیں، میں اُنہیں گمراہ نہیں کر سکوں گا، حق تعالیٰ شانہ نے بھی ابلیس پر یہ بات واضح فرمادی کہ میرے مخلص بندوں پر تیرا مکر نہیں چل سکے گا، اخلاص میں اللہ نے ایسی طاقت رکھی ہے، کہ

شیطان کے مکر اور حیلوں کا مضبوط سے مضبوط جال، اُس کے سامنے مکڑی کے جالے کی طرح کمزور اور ناتواں ثابت ہوتا ہے۔

اللہ فرماتا ہے: ﴿اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًا﴾ (النسآء:۷۶)

یعنی شیطان کا مکر انتہائی کمزور ہے۔

ابلیس نے اپنا مقصدِ حیات انسان کو گمراہی میں مبتلا کرنے کا بنایا، چنانچہ ابلیس اور اُس کی ذریت، ایک ایک انسان کے پیچھے اپنی توانائیوں کو صرف کرتے ہیں، انسان کی پیدائش سے لیکر موت تک قدم قدم پر گمراہی کے جال بچھاتے ہیں، ضلالت و معصیت میں مبتلا کرنے کا کوئی موقعہ اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیتے، لیکن مؤمن بندہ اللہ کے فضل سے اپنے ایمان پر قائم رہتا ہے، تو ابلیس اپنی کوششوں کو رائگاں دیکھتا ہے۔

موت کے وقت شیطان کی انسان کو گمراہ کرنے کی کوشش:

انسان کے جب مرنے کا وقت ہوتا ہے، تو یہ وقت شیطان کے لئے انسان کو گمراہ کرنے، اور اُس کو ایمان سے محروم کرنے کی کوشش کا آخری وقت ہوتا ہے، کیونکہ اُس کے بعد انسان ابلیس کے پنجہ سے نکل جاتا اور آزاد ہو جاتا ہے، اِس لئے ایمان والے کے لئے موت کا وقت بہت نازک اور بڑا کٹھن ہوتا ہے، پوری زندگی کا خلاصہ و نتیجہ اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے، یہ وقت وہ ہوتا ہے کہ اُس کے بعد اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، اُس کی اچھائی اور برائی کے دونوں سلسلے اختتام پذیر ہو جاتے ہیں، اُس کے اعمال کے سارے دفاتر لپیٹ دئے جاتے ہیں، لہٰذا شیطان اُس وقت اپنی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر، اپنی تمام کوششوں کو بروئے کار لاتا ہے، کوئی دقیقہ اِس سلسلے میں

فروگذاشت نہیں کرتا، اِس لئے یہ وقت مؤمن لے لئے بڑی کشمکش کا ہوتا ہے، چنانچہ حضور اکرم ﷺ کی دعاؤں میں یہ دعا بھی منقول ہے:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ یَّتَخَبَّطَنِیَ الشَّیْطَانُ عِنْدَ الْمَوْتِ''

(مشکوٰۃ باب الاستعاذۃ فصلِ ثالث ص۲۱۷)

اے اللہ: میں آپکی پناہ چاہتاہوں موت کے وقت شیطان کے مجھے اچک لینے سے۔

علامہ ابن الجوزیؒ نے لکھاہے، کہ جب ایمان والے کا مرنے کا وقت آتا ہے، اور وہ سکرات میں مبتلا ہوتا ہے، تو وہ وقت بڑا کٹھن اور بڑا سخت وقت ہوتا ہے، اِدھر یہ سکرات الموت میں مبتلا ہوتا ہے، اُدھر شیطان اُس کو ایمان وعقیدہ میں گمراہ کرتا ہے اور بسا اوقات برائی سے نکلنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے، یا اللہ کی رحمت سے مایوس کردیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ تو موت کی سختی میں مبتلا ہے، ایسی سختی تیرے اوپر ہورہی ہے، جن کی پہاڑ بھی طاقت نہیں رکھتے، تیرا رب تو تجھ پر نرمی کرتا تھا، اب مصیبت میں ڈالنے سے کیا فائدہ، تو اپنی محبوب چیزوں سے جدا ہوجائیگا، اور تیرا یہ بدن تو گل سڑ جائیگا، پھر کیا معلوم کہ کہاں تیرا ٹھکانہ ہوگا، پس اِن وساوس کی وجہ سے آدمی پریشانی میں پڑ جاتا ہے، اور بسا اوقات اسے اللہ کی تقدیر پر اعتراض پیدا ہوجاتا ہے۔

(الثبات عند الممات ص۵۷)

امام قرطبی نے فرمایاہے کہ جب مرنے والے کے حلق میں روح اٹکتی ہے، اُس وقت اُس پر فتنے پیش آتے ہیں اُس وقت ابلیس اپنے مددگاروں کو لگا دیتا ہے، وہ مرنے والے کے ماں باپ بھائی وغیرہ (جو وفات پا چکے) کی شکل میں ظاہر ہوکر کہتے ہیں، کہ تو اب مر رہاہے، اور ہم تو تجھ سے پہلے دنیا

سے جا چکے ہیں، لہٰذا تو یہودی ہو کر مرنا، کیونکہ وہی دین اللہ کے پاس مقبول ہے، اگر مرنے والا اُس کا انکار کرتا ہے، تو وہ شیاطین چلے جاتے ہیں، اور دوسرے شیاطین اُس کے کسی دوسرے رشتہ دار کی شکل میں آتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ تو عیسائی ہو کر مرنا، کیونکہ یہ عیسیٰ کا دین ہے جس نے موسیٰ کے دین کو منسوخ کر دیا تھا، اور اُس کے سامنے اُس دین کے عقائد پیش کرتے ہیں، اُس وقت بعض لوگوں کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

(التذکرۃ فی احوال الموتیٰ وامور الآخرۃ للقرطبی ص۱۸۶)

موت کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ مخلص بندے کی مدد:

اُس وقت مؤمن کا اخلاص کام آتا ہے، جس شخص نے اللہ کی رضا وخوشنودی کو مقصود بنایا، عبادات وطاعات اللہ کے لئے انجام دیں، نماز اللہ کے لئے پڑھی، ذکر اللہ کے لئے کیا، سبق اللہ کے لئے پڑھایا، فتویٰ اللہ کے لئے لکھا، بیان اللہ کے لئے کیا، اللہ کے دین کے اِحیاء کے لئے اپنی صلاحیتیں خرچ کیں، تو جان کَنی کے نازک اور مشکل وقت میں، اللہ بھی اُس کی مدد فرماتا ہے، جبرئیل علیہ السلام کو اس کی مدد کے لئے بھیجتا ہے، وہ شیطان کو وہاں سے ہٹا دیتے ہیں، اور اُس کے چہرے سے گرد وغبار کو صاف کرتے ہیں، اُسے بشارت سناتے ہیں، اُس وقت مرنے والا مسکرا دیتا ہے، حضرت جبرئیل اُس سے کہتے ہیں، کہ کیا تو نے مجھے پہچانا؟ میں جبرئیل ہوں، یہ سب شیاطین تیرے دشمن تھے، چنانچہ پھر یہ وقت مرنے والے کے لئے نہایت خوشی وفرحت کا ہوتا ہے۔ (حوالۂ بالا)

مذکورہ بالا آیات اور روایات سے معلوم ہوا، کہ مؤمن کے پاس، ابلیس

کے مقابلہ کے لئے سب سے بڑا ہتھیار اخلاص ہے، شیطان لعین کی جانب سے بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ مؤمن کو بے ایمان بنا کر دنیا سے رخصت کرے، اور کفر و شرک پر اُس کا خاتمہ ہو، لیکن بندہ اگر صدق اور اخلاص والا ہے، تو آیتِ کریمہ:

﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ مِنْ سُلْطَانٍ﴾ (بنی اسرائیل:۶۵)

(بے شک میرے نیک بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا) کی صراحت کے مطابق، شیطان لعین کی ہزار کوششیں بھی رائگاں ہو جاتی ہیں، جس بندے نے اپنے نفس کے تقاضوں کو دبایا، اور اپنے اخلاص میں کمی نہیں آنے دی، حق تعالی بھی اُس کے ایمان میں تزلزل نہیں آنے دیتے، شیطان کو ذلیل کر کے ہٹا دیتے ہیں، اور اپنے اُس بندہ کو ایمان اور ہدایت پر ثابت قدم رکھتے ہیں۔

شیطان کی امام احمد بن حنبل کو بہکانے کی کوشش اور ان کا جواب:

علامہ قرطبی نے اِس نوع کا حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ نقل کیا ہے، جب اُن کی وفات کا وقت قریب آیا، تو اُن کے بیٹے عبد اللہ بن احمد حاضر ہوئے، دیکھا کہ اُن پر بار بار غشی طاری ہو جاتی ہے، جب اِفاقہ ہوتا، تو یہ کہتے، ’’لا بعدُ، لا بعدُ‘‘ ابھی نہیں ابھی نہیں، کئی مرتبہ ایسا کہا، اُن کے بیٹے عبد اللہ بن احمدؒ نے معلوم کیا، کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کس سے بات کر رہے ہیں؟ فرمایا: شیطان اپنی انگلی اپنے دانتوں میں دبا کر کھڑا ہے، اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اے احمد! تو مجھ سے چھوٹ کر نکل گیا، میں اُس سے کہہ رہا ہوں، ابھی نہیں ابھی نہیں، جب تک میری روح جسم سے نہ نکل جائے اُس وقت تک

مجھے تیری ضلالت اور گمراہی کی طرف سے بھروسہ نہیں، اطمینان نہیں۔

مؤمن کے اخلاص سے شیاطین کا کمزور ہو جانا:

مؤمن کے اخلاص سے شیطان کا مکروفریب کا مضبوط جال بھی کمزور اور ناپائدار ہو جاتا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُنْضِئُ شَيَاطِيْنَهٗ كَمَا يُنْضِئُ اَحَدُكُمْ بَعِيْرَهٗ فِي السَّفَرِ»
(مسند احمد حدیث ۸۹۲۷)

کہ بلاشبہ مؤمن اپنے شیاطین کو (صدق واخلاص کی برکت سے) اِس طرح کمزور کر دیتا ہے، جیسے سفر میں کوئی اپنے اونٹ کو کمزور کر دیتا ہے۔

لٰہذا بندہ کی سعادت مندی اِسی میں ہے کہ اپنے ہر عمل سے اللہ کی خوشنودی اور اُس کی رضا کا طالب رہے، نیت میں کھوٹ اور فساد نہ آنے دے، اور اللہ تعالیٰ سے حفاظتِ ایمان کی دعا بھی کرتا رہے۔

ذکر اللہ کس نیت سے کیا جائے؟

حدیث میں ہے: «لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ»۔ (ترمذی ج۲ ص۱۷۵)

یعنی مسلسل تیری زبان اللہ کے ذکر سے تروتازہ رہے، اور خاص طور پر یہ نیت کرے کہ مرتے وقت زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہو کہ زندگی بھر ذکر کرنے سے زبان ذکر سے مانوس ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں موت کے وقت بھی ذکر کی توفیق حاصل ہو گی۔

اِس سلسلے میں قطب الارشاد، تاج العلماء، حضرت اقدس مولانا رشید احمد

صاحب گنگوہیؒ کا بیان فرمودہ یہ واقعہ نہایت اہم اور سبق آموز ہے:

سپاہی اور طوطے کا سبق آموز واقعہ:

ایک روز فرمانے لگے، کہ کسی نے ایک شخص سے دریافت کیا کہ میاں! تیرا کوئی پیر بھی ہے؟ اُس نے کہا، جی پیر تو میرے بہت سے ہیں، مگر دو پیر میرے اصل ہیں، ایک طوطا، اور ایک تلنگا (سپاہی) اور یہ اِس طرح کہ میرے محلہ میں ایک تلنگا رہتا تھا، ہمیشہ سویرے اٹھتا، منہ ہاتھ دھوتا، وردی پہنتا، اور بن سنور کر بادشاہ کے یہاں اپنی نوکری پر جایا کرتا تھا، میں اُس کو دیکھا کرتا تھا، آخر ایک دن مجھے خیال ہوا کہ اگر ایک دن یہ اپنی نوکری پر نہ جاوے، تو بادشاہ اُس کو موقوف کردے، اِسی طرح اگر تُو اپنے آقائے وحدہ لاشریک کی حضوری، اور اللہ کی یاد سے غافل ہوا تو، تو بھی تلنگے کی طرح موقوف کر دیا جائے گا، پس اُسی دن سے میں ذکر الٰہی میں شاغل ہوں، کبھی ناغہ نہیں کرتا۔

طوطے کا پیر ہونا اِس طرح ہے کہ میرے محلہ میں ایک پڑوسی نے طوطا پال رکھا تھا، جو میٹھی میٹھی باتیں کرتا، اور اپنی بولیوں پر لوگوں کو فریفتہ بنایا کرتا تھا، ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اُس کو بلی نے آدبوچا، جس وقت بلی کے پنجے اُس پر پڑے، تو اُس نے کہا "ٹیں" بجز اُس لفظ کے اُس کو کچھ بھی یاد نہ رہا، ساری بولیاں، دل بہلانا اور، چہچہانا بھول گیا، میں یہ قصہ دیکھ رہا تھا، اُسی وقت دل میں یہ مضمون پیدا ہوا کہ اِسی طرح موت کے پنجے کا شکار ہوتے وقت آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے، بجز اُس اصلی حالت کے جو طبعی ہے اور کوئی بات یاد نہیں رہتی، پس میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد میں لگ گیا،

تاکہ مرتے وقت ذکر اللہ کے سوائے کچھ نہ نکلے۔

احقر کے والد ماجد کا ذکر کا اہتمام اور قابلِ رشک موت:

احقر کہتا ہے کہ میرے والد ماجد اپنی زندگی میں اِس ذکر کا بہت ورد رکھتے تھے:
«سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ، عَدَدَ خَلْقِهٖ، وَرِضَا نَفْسِهٖ، وَزِنَةَ عَرْشِهٖ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهٖ»۔ (مشکوٰۃ ج ا ص ۲۰۰ بحوالہ مسلم)

اِس ذکر کی فضیلت کے بارے میں مسلم شریف میں ایک واقعہ آیا ہے، ازواجِ مطہرات میں سے حضرت جویریہ ؓ فجر کی نماز پڑھ کر اپنی اُسی جگہ ذکر میں مشغول ہو گئیں، حضور اکرم ﷺ باہر تشریف لے گئے، آپ کو واپس آنے میں تاخیر ہوئی، چنانچہ چاشت کے وقت آپ علیہ السلام گھر تشریف لائے، اور اُن کو اُسی حالت پر ذکر میں مشغول پایا، آنحضرت ﷺ نے دریافت کیا، کہ تم صبح سے اب تک اپنی اُسی حالت پر ذکر میں مشغول ہو؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ جی ہاں، آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ تمھارے پاس سے جانے کے بعد میں نے چار کلمات تین مرتبہ پڑھے ہیں، اگر اُن کلمات کا تمھارے صبح سے اب تک کیئے ہوئے ذکر سے موازنہ کیا جائے، تو یہ چار کلمات اس تمام ذکر پر غالب آجائیں، پھر آپ علیہ السلام نے مذکورہ چار کلمات بیان فرمائے۔ (مشکوٰۃ ج ا ص ۲۰۰ بحوالہ مسلم)

والدِ محترم رحمۃ اللہ علیہ عالم نہ تھے، لیکن کتبِ حدیث کے اردو ترجمے اُنھوں نے گہرائی سے پڑھے تھے، مذکورہ روایت اُنھوں نے مظاہرِ حق قدیم میں پڑھی، اُس کے بعد سے مذکورہ کلمات کو وہ وِرد کے طور پر پڑھتے تھے، بندہ اُن کی وفات کے وقت حاضر تھا، جب اُن کی نزع کا وقت قریب آیا، اور ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی، اُس وقت میں اُن کی زبان پر یہی کلمات جاری

تھے، سکرات الموت کی وجہ سے اُن کی گردن دائیں بائیں گھوم رہی تھی، اور یہ ذکر غیر اختیاری طور پر زبان پر جاری تھا، حتیٰ کہ اِسی حالت میں مکمل بے ہوشی ہوگئی، اور واصل الی اللہ ہوگئے، حق تعالیٰ شانہ اُن کی پوری مغفرت فرمائے، اور درجات کو بلند فرمائے، وہاں کی لازوال نعمتوں سے مالامال فرمائے۔

احقر نے سہارنپور آکر حضرت شیخ یونسؒ کو حضرت والد صاحب کی وفات کے وقت کا یہ واقعہ سنایا، تو آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ قابلِ رشک موت ہے، معلوم نہیں کہ ہمارا کیا حال ہوگا۔

حق تعالیٰ شانہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مراتبِ عُلیا اور اپنا قربِ خاص عطا فرمائے، اور اُن مخلصین کی برکت سے ہمارے حال پر بھی رحم فرمائے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا جذبۂ اخلاص:

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے جذبات قرآنِ کریم کے اندر بیان فرمائے گئے:

﴿اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ﴾

(الانعام: ۱۶۲)

میری جانی عبادت بھی اللہ کے لئے، مالی عبادت بھی اللہ کے لئے، میرا جینا بھی اللہ کے لئے، مرنا بھی اللہ کے لئے ہے، حضور اکرم ﷺ کی مأثور دعاؤں میں بھی یہ مضمون اور یہ الفاظ منقول ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے اپنے اِن مقرّبین کو صدق واخلاص کا اعلیٰ درجہ عطا فرمایا تھا، اللہ اپنے فضل سے ہمیں بھی اُس کا کوئی حبہّ وشمہّ عطا فرمائے۔

حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ کا مثالی اخلاص:

ہمارے اَسلاف ہمارے لئے نمونہ چھوڑ گئے، حضرت مولانا سید اسماعیل شہید کا وعظ بہت مؤثِر ہوتا تھا، کئی کئی گھنٹہ کا وعظ ہوتا تھا، بڑا مجمع حضرت کے وعظ میں شریک رہتا تھا، دہلی کی جامع مسجد میں عموماً وعظ ہوتا تھا، ایک مرتبہ دہلی کی جامع مسجد میں وعظ ہوا، مجمع اس قدر تھا کہ مسجد بھری ہوئی تھی، دو گھنٹہ تک وعظ چلا، وعظ ختم ہوا، لوگ جانے لگے حتی کہ مسجد خالی ہوگئی، صرف چند لوگ باقی رہ گئے تھے، ایک دیہاتی آیا، اور افسوس کے ساتھ کہا کہ حضرت مجھے بہت احساس ہے میں تاخیر سے آیا، اور آپ کا وعظ نہیں سن سکا، حضرت نے فرمایا کہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں، تم بیٹھو، میں تمہیں وعظ سناتا ہوں۔

چنانچہ حضرت نے اُس شخص کو مکمل دو گھنٹوں کا وعظ سنایا، اُس کے سامنے پورے وعظ کو دہرایا، بات پوری ہوئی، کسی نے حضرت سے کہا کہ حضرت! مجمع کے سامنے طویل وعظ کہنا آسان ہوتا ہے، مخاطب اگر ایک دو افراد ہوں، تو طویل وعظ بہت مشکل ہوتا ہے، ذہن میں مضامین نہیں آتے، آپ نے تنہا اُس شخص کے لئے دو گھنٹے کیسے وعظ کہہ دیا؟ حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ نے جواب میں فرمایا: کہ بھائی جب سامعین کا مجمع کثیر تھا، اُن سے مسجد بھری ہوئی تھی، اُس وقت میں نے جو وعظ کہا، وہ بھی اللہ کے لئے کہا، اور اِس ایک شخص کے لئے جو وعظ کہا ہے، یہ بھی اللہ کے لئے کہا، میرا پہلا وعظ بھی اللہ کے لئے تھا، اور یہ وعظ بھی اللہ کے لئے ہے، لہذا میرے لئے دونوں برابر ہیں، دوسری مرتبہ کے وعظ میں بھی مجھے کسی قسم کی اُکتاہٹ نہیں ہوئی۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے صدق وخلوص کا ایک اور واقعہ:

حضرت مولانا سید اسماعیل شہید ایک مرتبہ وعظ فرمارہے تھے، گستاخ لوگ ہر زمانے میں ہوا کرتے ہیں، وعظ کے دوران ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم حرامی ہو، حضرت نہ ناراض ہوئے، نہ غصہ ہوئے، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ فرمایا: کہ بھائی دیکھو! یہ خبر تمہیں غلط پہنچی ہے، میرے والدین کے نکاح کے گواہ ابھی بھی پھلت میں موجود ہیں، یہ حضرات اصل میں پھلت ضلع مظفر نگر کے باشندے تھے، اِس لئے کہا کہ میرے والدین کے گواہ پھلت میں ابھی تک موجود ہیں، اِس لئے یہ خبر جو تمہیں پہنچی ہے، وہ غلط پہنچی ہے، یہ کہکر پھر اپنے وعظ کا سلسلہ شروع کردیا، طیش نہیں آیا، جوش نہیں آیا، ناراض نہیں ہوئے، غضبناک نہیں ہوئے، کیونکہ جو عمل جاری تھا، جو وعظ فرمارہے تھے، وہ اپنی شہرت اور ناموری کے لئے نہیں، بلکہ محض اللہ کے لئے، اور اللہ کی رضا کے لئے تھا، اِس لئے یہ نہیں سوچا کہ میں بڑا عالم ہوں، اِن لوگوں کا مقتدا ہوں، میری بڑی حیثیت ہے، اِس شخص نے میرے متعلق سب کے سامنے ایسی اہانت آمیز بات کیوں کہی، درحقیقت یہ حضرات اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو مٹائے ہوئے تھے، اِس لئے اُن کی طبیعت ایسی احمقانہ باتوں سے متأثر نہیں ہوتی تھی۔

حضرت شیخ یونس صاحبؒ کا صدق واخلاص اور اپنا محاسبہ:

ہمارے حضرت شیخ یونس صاحبؒ جن کے اِجمالی قول کی یہ تفصیل چل رہی ہے، حضرت بہت ترغیب دیا کرتے تھے، کہ جو کرو اللہ کے لئے کرو، ایک مرتبہ ایک عجیب سی کیفیت حضرت پر طاری تھی، مجھے خطاب کرکے

کہا کہ: مولوی طاہر! سبق پڑھاؤ تو یہ نیت کرو کہ اللہ راضی ہو جائے، فتوی کی دو سطر لکھو، تو یہ نیت کرو کہ اللہ راضی ہو جائے، جو بھی کام کرو، اُس میں یہ نیت کرو کہ اللہ راضی ہو جائے۔

نیز فرمایا کہ بخاری شریف کے سبق میں ایک مقام بہت مشکل تھا، میں نے پڑھایا، اور اللہ کے فضل سے وہ سبق بہت اچھا حل ہوا، تو میری طبیعت میں کچھ عجب پیدا ہوا، میں نے اللہ سے توبہ کی، استغفار کیا، کہ یا اللہ چار لفظ کسی نے میری تعریف کے کہہ دئے، تو اِس سے میری آخرت کا کیا بھلا ہو گا؟ میرے لئے آخرت میں کیا کام آئیگا، ہمارے یہ حضرات اپنا محاسبہ کیا کرتے تھے، ہر چیز میں، ہر عمل میں، اللہ ہمیں بھی اُن کا اتباع نصیب فرمائے۔

صدق واخلاص کس طرح حاصل ہو؟

محاسبۂ نفس اور اپنے حال کی طرف توجہ کرتے رہنے سے بتدریج اخلاص حاصل ہوتا ہے، ہمارے استاذ حضرت مفتی نظام الدین صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آدمی کو اپنے قلب کی طرف توجہ کرتے رہنا چاہئے، قلب کو ٹٹولے اور یہ غور کرے کہ میری نیت کس قدر صحیح ہے؟ اور کس قدر نیت میں فساد ہے؟ اگر نیت میں کچھ کمی محسوس ہو تو اُس کمی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ بندہ اولاً اس بات پر غور کرے کہ عمل میں صحیح نیت کیا ہے؟ فاسد نیت کیا ہے؟ صدق کیا ہے؟ اخلاص کیا ہے؟ میں نے اِس عمل میں جو نیت کی ہے، صدق واخلاص کے لحاظ سے اُس میں کیا کمی ہے؟ اگر کمی محسوس ہو تو مایوس نہ ہونا چاہئے، بلکہ اُس کمی کو بتکلف دور کرنے کی کوشش

کرے، اِس سے کافی حد تک نیت میں سدھار آجائیگا، کچھ روز کے بعد پھر قلب کی جانب متوجہ ہو اور دیکھے کہ اب قلب کا کیا حال ہے، اس سے پہلے جو کمی تھی وہ دور ہوئی یا نہیں، اگر دور ہو گئی تو اِس پر اللہ کا شکر ادا کرے، اور اگر پھر بھی کچھ کمی محسوس ہو، تو سابق طریقہ پر اُس کمی کو دور کرنے کی سعی کرے، اِس طرح بار بار کی توجہ اور اخلاص کی کوشش سے نیت صحیح ہو جائیگی۔

اپنی کمی کے احساس اور اصلاح کی فکر پر اللہ کی مدد آتی ہے، ایسی صورت میں حق تعالیٰ شانہ کو اُس بندے پر رحم آتا ہے، کہ یہ بندہ مجھے راضی کرنے کے لئے اصلاح کی کوشش میں لگا ہوا ہے، اپنی کوتاہی اور کمزوری کا معترف ہے، تو یہ میری رحمت کا مستحق ہے، پھر حق تعالیٰ شانہ اُس کی رہنمائی فرماتا ہے، اخلاص میں ترقی ہوتی رہتی ہے، حتی کہ صدق کا کمال درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

دنیا کی فنائیت اور موت کا استحضار کریں:

دفعِ مضرت، جلبِ منفعت سے اہم اور مقدم ہے، اِس لئے فطری طور پر منفعت کے بجائے مضرت کی قبیل کی چیزوں سے قلب زیادہ متأثر ہوتا ہے۔

لہٰذا قلب کی کیفیت میں تبدیلی لانے کے لئے دنیا کی فنائیت ذہن میں لاوے، موت کا استحضار کرے، اور یہ سوچے کہ میرے آباء واجداد، اِس دنیا میں نہیں رہے، مجھے بھی موت کی گھاٹی پار کرنی ہے، اللہ نے مجھے ٹوٹے پھوٹے اعمال کی جو توفیق دے رکھی ہے، اُن میں میری کیا نیت ہونی چاہئے؟ کس نیت سے کیا ہوا عمل موت کے وقت کام آئیگا؟ کون سی نماز، کونسا ذکر،

کون سی تلاوت قبر میں کام آئیگی، کس نیت سے کیا ہوا عمل شیطان کی گمراہی سے حفاظت کا ذریعہ بنے گا؟اِس نوع کے مراقبہ سے قلب میں مہمیز لگے گی، نیت کا کھوٹ ختم ہو گا، اور قلب کی زمین اخلاص وصدق میں ترقی کے لئے تیار ہو جائیگی۔

ترمذی کی حدیث ہے کہ: موت کو کثرت کے ساتھ یاد کرنے سے قلب کا زنگ ختم ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ شانہ ہمارے افعال میں بھی صدق عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجلس (۴)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیۡرِ خَلۡقِہٖ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ۔ اَمَّا بَعۡدُ

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطَانِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِیۡنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

صدق کا چوتھا درجہ صدق فی الاحوال:

اِس سے پہلی مجلس میں صدق کے تیسرے درجہ ''صدق فی الافعال'' کی تشریح کی گئی، حضرت شیخ یونس صاحب قدس سرہ کے بیان کے مطابق صدق کا چوتھا درجہ ''صدق فی الاحوال'' ہے، آج کی مجلس میں اُسی کی تشریح کا ارادہ ہے، حق تعالیٰ شانہ صحیح تشریح کی رہنمائی فرمائے۔

صدق فی الاحوال کی دوسری تعبیر ''صدقِ حالی'' ہے، صدقِ حالی پر ایک مختصر کلام، امام غزالی کی مشہور کتاب ''تبلیغِ دین'' میں ملا ہے، جو اِس درجہ کی تشریح کے لئے متن اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے، ہم اولاً اُس کلام کو نقل کرتے ہیں:

ظاہر و باطن یکساں ہو:

وہ فرماتے ہیں کہ: صدقِ حالی یہ ہے کہ (آدمی) کا ظاہر و باطن یکساں

ہو یعنی ظاہری حالت بھی وہی ہو، جو واقع میں باطن کی حالت ہو، مثلاً نرم چال چلے، اور ظاہر کرے کہ طبیعت میں وقار ہے، مگر حقیقت میں قلب کے اندر وقار نہ ہو، بلکہ محض لوگوں کے دکھانے کو ایسا کرے، تو اُس کا نام ریاء ہے۔

اور اگر لوگوں کے دکھانے کا خیال نہ ہو، بلکہ محض غفلت و بے توجہی ہو تو اُس کا نام اگر چہ ریاء نہیں، مگر صدق بھی نہیں ہے، بلکہ حالت کا دروغ اور جھوٹ ہے۔

اِس لئے رسولِ مقبول ﷺ نے دعا کی ہے: کہ بارِ الٰہا! میرا باطن میرے ظاہر سے بہتر بنا دے، اور ظاہری حالت کو بھی صالحیت عطا فرما۔ (تبلیغِ دین ۲۵۱)

اِس عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر ظاہر و باطن میں یکسانیت نہ ہو، بلکہ باطنی حالت ظاہر کے خلاف ہو، تو یہ صدق کے خلاف تو یقیناً ہے، اور یہ حالت کا دروغ اور کذب کہلاتا ہے، البتہ ظاہر و باطن کا یہ فرق، اگر غفلت اور بے توجہی کے باعث ہو، تو اُس کا مفسدہ خفیف ہے، اور اگر بالقصد ہو، یعنی بزبانِ حال اپنا کوئی کمال ظاہر کرے، حالانکہ وہ اُس کمال کے ساتھ متصف نہیں ہے، تو یہ ریاء ہے جو معصیت ہے، اور حق تعالیٰ شانہ کی ناراضگی کا موجِب ہے حضور اکرم ﷺ نے ایسے شخص پر صراحتاً کذب کا حکم لگایا ہے۔

جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے مت بنو:

بخاری شریف کی حدیث ہے: «اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُوْرٍ» (بخاری شریف ج ۲ ص ۷۸۵)

یعنی جو شخص اپنے اندر کسی اچھی صفت کے موجود ہونے کا اظہار کرے، حالانکہ حقیقتاً وہ صفت اُس میں نہیں پائی جاتی، تو یہ شخص گویا جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا ہے۔

اِس جملے میں زمانۂ جاہلیت کے ایک عملی محاورہ کی طرف اشارہ ہے، وہ یہ کہ اُس وقت جو قوم کے سردار ہوتے تھے، وہ اپنی مالداری اور بڑائی جتانے کے لئے ڈبل قمیص پہنتے تھے، لہٰذا جو شخص اپنے جسم پر دو قمیص پہنے ہوئے ہوتا تو لوگ سمجھ جاتے کہ یہ شخص اپنی قوم کا سردار ہے، پیشوا ہے، اُس کی تعظیم و تکریم کرتے، بعض لوگ جو نہ سردار ہوتے، نہ مالدار ہوتے، وہ اُن سرداروں کی حرص کرتے، اور ڈبل قمیص پہننے کے خواہاں ہوتے، تاکہ لوگ سرداروں جیسا اُن کا ادب واحترام کریں، لیکن مالی وسعت نہ ہونے کی وجہ سے وہ دو قمیص تو نہ خرید پاتے، ایک ہی قمیص ان کو میسر ہوتی، البتہ اُس میں آستین ڈبل لگوالیا کرتے، جس سے لوگوں کو یہ محسوس ہوتا کہ یہ شخص دو قمیص پہنے ہوئے ہے، اور یہ اپنی قوم کا سردار ہے، اِس طرح اپنی حالت سے لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنے لئے بے جا تعظیم و تکریم کے خواہاں ہوتے، جب لوگوں پر ایسے شخص کی حقیقت عیاں ہو جاتی، تو لوگ اُس کے متعلق کہتے کہ یہ شخص جھوٹ کے دو کپڑے پہنے ہوئے ہے، یعنی اپنی حالت کے ذریعہ لوگوں کو فریب دے رہا ہے۔

علامہ زمخشریؒ نے فرمایا کہ پھر یہ جملہ مجازی طور پر اُس شخص کے لئے استعمال ہونے لگا، جو اپنے عمل اور اپنی حالت سے کسی ایسے کمال اور ایسی صفت کو ظاہر کرے جو کمال اس میں نہ پایا جاتا ہو اور جس صفت کے ساتھ وہ

متصف نہ ہو، کیونکہ یہ شخص بھی اپنی حالت کے ذریعہ لوگوں کو فریب دینا چاہتا ہے، اُس کے ظاہر وباطن میں فرق ہے، اِس لئے اُس کی دو حالتوں کو آنحضرت ﷺ نے جھوٹ کے دو کپڑوں سے تعبیر فرمایا۔

پھر انسان اپنے تمام بدن پر عموماً دو کپڑے پہنتا ہے، اِس لئے اِس تعبیر میں اِس طرف اشارہ ہے کہ ایسا شخص از سر تاپا جھوٹ کے ساتھ متصف ہے۔
(فتح الباری ج۹ ص۲۶۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا، کہ جس شخص کی حالت کذب کی ہے، اُس کے قلب میں استقامت، اور سلامتی نہیں ہوتی، وہ زمرۂ صادقین میں داخل نہیں ہے، اور وہ اِس قابل نہیں کہ خلقِ خدا کو فیضیاب کرے، اور اُن کی رہنمائی کر سکے۔

کذبِ حال کی مختلف صورتیں:

ظاہر وباطن کی بالقصد مخالفت جس سے لوگوں کو دھوکہ ہو، کئی طرح سے ہوا کرتا ہے:

اول: بدن کے ذریعہ، مثلاً ضعف و شکستگی ظاہر کی جائے، تاکہ لوگ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں، یا غمگین صورت بنائے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ اُن کو آخرت کی بڑی فکر ہے۔

دوسرے: ہیئت کے ذریعہ، مثلاً رفتار میں نرمی لانا، سجدہ کے نشان کا باقی رکھنا، یا آنکھیں بند کرنا، جس سے لوگ سمجھیں کہ حالتِ وجد میں ہے، یا مکاشفہ میں مشغول ہے اور فکر کے اندر مستغرق اور محو ہے۔

تیسرے: شکل وشباہت اور لباس کے ذریعہ، مثلاً موٹے جھوٹے کپڑے

پہننا، کپڑے میلے رکھنا، تاکہ لوگ صوفی اور بزرگ خیال کریں، حالانکہ تصوف سے اتنے کورے ہیں کہ اُس کی حقیقت وماہیت بھی نہیں جانتے۔

چوتھے: گفتگو اور زبان کے ذریعہ، جیسے بعض دنیا دار واعظ زبان موڑ موڑ کر مقفّٰی و مسجّع عبارتیں بنا بنا کر سلفِ صالحین کی نقل اُتارتے ہیں، اور غمگین صورت بناتے ہیں، حالانکہ دل پر خاک اثر نہیں، مگر بناوٹ اور تصنع یہ بتارہا ہے کہ بڑے عالم اور بڑے صوفی ہیں۔

پانچویں: عمل کے ذریعہ، مثلاً قیام لمبا کرنا، رکوع و سجدہ میں دیر تک رہنا، تاکہ لوگ بڑا عبادت گذار خیال کریں، حالانکہ جب تنہائی میں نماز پڑھتے ہیں تو ان چیزوں کا لحاظ نہیں کرتے۔

چھٹے: اپنے شاگردوں اور مریدوں کی کثرت کا تذکرہ کرنا، تاکہ لوگ سمجھیں کہ اُن کا بڑا فیض ہے وغیرہ، یہ تمام صورتیں ریاء کی اور کذبِ حال کی ہیں، ایسے لوگ تصنع اور تکلف میں مبتلا رہتے ہیں، اِس لئے اُن کو صدق کے مقامات تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

حضراتِ صحابہؓ کا تکلفات سے گریز:

حق تعالیٰ شانہ کو سادگی پسند ہے، حضراتِ صحابہؓ اور سلَفِ صالحین سادہ مزاج تھے، اُن کے احوال واطوار تصنع و تکلف سے پاک تھے، اُن کا سینہ مثلِ آئینہ کے صاف وشفاف تھا، اِسی لئے اُن کے سینوں سے علم و معرفت کے دریا بہے، اور قیامت تک کے لئے اُن کا علمی و عملی فیض جاری ہو گیا۔

مشکوۃ شریف میں فضیلتِ صحابہؓ کے سلسلہ میں ایک مفصل حدیث ہے، جس کا مضمون بھی اہم ہے، اور اِس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ فضائلِ

صحابہؓ کے بارے میں یہ حدیث خود صحابیٔ رسول حضرت عبد اللہ بن مسعود کی زبان سے نکلی ہوئی ہے، اُس مفصل حدیث کے چند جملے یہ ہیں:

«كَانُوْا اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ» کہ حضراتِ صحابہؓ اِس امت میں سب سے افضل ترین تھے، کس اعتبار سے افضل تھے؟ فضیلت کی کیا بات ان کے اندر تھی؟

اِس کی تفصیل اِن الفاظ سے بیان کی:

«اَبَرَّهَا قُلُوْبًا، وَ اَعْمَقَهَا عِلْمًا، وَ اَقَلَّهَا تَكَلُّفًا، اِخْتَارَ هُمُ اللهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ، وَاِقَامَةِ دِيْنِهٖ، فَاعْرِفُوْالَهُمْ فَضْلَهُمْ»

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ فصلِ ثالث ص ۳۲)

یعنی وہ قلوب کے اعتبار سے نیک ترین تھے، اور اُن کی زندگی میں تکلف نہیں تھا اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنے نبی کی صحبت کے لئے، اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لئے منتخب کیا، پس تم ان کی فضیلت کو پہچانو۔

اس روایت میں حضرت عبد اللہ بن مسعود نے تین وجہیں افضلیت کی بیان فرمائیں:

اول: ''اَبَرَّهَا قُلُوْبًا'' قلوب کے اعتبار سے نیک ترین تھے، اللہ نے ان کے قلوب کا امتحان لیا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ (الحجرات:۳)

تو اُن کو رضا بالقضاء کے ساتھ متصف پایا اور اُن کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ عطا کیا۔

دوسرے: ''وَاَعْمَقَهَا عِلْمًا'' وہ بہت گہرے علم والے تھے، اُن کے علم

میں رسوخ تھا، شریعت کے اَسرار اور موز ان پر منکشف تھے۔

تیسرے: ”وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا“ اُن کی زندگی میں تکلف نہیں تھا، اِس قسم کے موقعہ میں ”اقل“ کے لفظ سے کسی شئ کی نفی کرنا مقصود ہوتا ہے، اِس لئے معنی یہ ہیں کہ حضراتِ صحابہ کی زندگی میں تکلف نہیں تھا، اُن کے ظاہرو باطن میں فرق نہیں ہوتا تھا، بلکہ یکسانیت ہوتی تھی۔

مشہور شارحِ مشکوٰۃ ملا علی قاری جن کو حدیث کی تشریح اور مغلق مضامین کی توضیح و تفہیم کا خاص ملکہ عطا ہوا تھا، انہوں نے ”وَاَقَلَّهَا تَكَلُّفًا“ کی شرح کرتے ہوئے فرمایا ہے، کہ صحابہ کی زندگی میں تکلف نہیں تھا، اُن کا حال یہ تھا کہ کھانے کو ملتا، کھالیتے نہ ملتا تو نہ کھاتے، بلکہ فاقہ کرتے، اچھا ملتا اچھا کھاتے، سادہ ملتا سادہ کھاتے، لباس میں بھی تکلف نہیں تھا، اچھا ملا تو اچھا پہنا، سادہ ملا تو سادہ پہنا، جوتا میسر ہوتا تو جوتا پہن کر چلتے، جوتا نہ ہوتا تو ننگے پاؤں چلتے، جو بات معلوم نہ ہوتی، ساتھی سے معلوم کرلیتے، اور جو بات خود کو معلوم ہوتی وہ ساتھی کو از خود بتادیا کرتے، وغیر ذلک من احوالھم۔

حقیقت یہ ہے کہ عدمِ تکلف، اور سادگی کی یہ بہترین ترجمانی ہے، جو حضراتِ صحابہ کے احوالِ واقعی کے بالکل مطابق ہے، اِس لئے کہ جس طرح ہر موقعہ پر عمدہ اور اچھی شئ کا اہتمام عُجب ہے، اور تواضع و فروتنی کے خلاف ہے، اِسی طرح عمدہ اور اچھا میسر ہوتے ہوئے سادہ اور گھٹیا کا التزام تکلف ہے، اور سادگی کے خلاف ہے، بلکہ جیسا موقعہ ہو، اور میسر ہو، اُس کو اختیار کرنا سادگی ہے۔

حضراتِ صحابہ اِن اہتمامات اور تکلفات سے پاک تھے، اُن کا حال یہ تھا

کہ جو کچھ اُن کے دل میں ہوتا، اُن کی زبان سے بھی وہی بات نکلتی، اور اعضاء و جوارح کا عمل بھی اُس کے مطابق ہوتا، سادگی اور ظاہر وباطن کی اِسی یکسانیت کی وجہ سے اُن حضرات کو صدق کے اعلٰی مراتب حاصل ہوئے۔

ہمارے اکابر، صحابہ اور اَسلاف کا نمونہ تھے:

ہمارے اکابر، اَعلَی اللہ درجاتہم ، اَسلاف کا نمونہ تھے، اُن کو بھی اُن صفات کا وافر حصہ عطا ہوا تھا،مثال کے لئے سید الطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں:

حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ہجرت کرکے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے میرٹھ کے ایک صاحب تھے ،اُنہوں نے حج کا ارادہ فرمایا، فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحبؒ سے مجھے غائبانہ عقیدت ہوگئی ،میری ملاقات تو نہیں تھی، لیکن حضرت کے حالات اور صفات سن کر حضرت سے محبت وعقیدت ہوگئی، میں نے حضرت حاجی صاحب کے لئے بکری کے بالوں کی ایک کملی تیار کی، بکریوں کے اوپر جو نرم بال آتے اُن کو میں کاٹ لیتا، اُن بالوں سے ایک کملی بنائی، کہ جب میں وہاں جاؤں گا تو یہ کملی تحفہ میں حضرت کو پیش کروں گا۔

چنانچہ رختِ سفر باندھا، اور حج کے لئے روانہ ہوگئے، بحری جہاز سے جانا ہوتا تھا، فرماتے ہیں کہ ہمارا جہاز کئی روز چلتا رہا، ایک روز دریا میں طغیانی آئی، ہوا مخالف ہوئی، اور جہاز کے لئے خطرہ پیدا ہوگیا، بلکہ ذمہ داروں کی طرف سے خطرے کی گھنٹی بجادی گئی، ہوا اتنی مخالف ہوئی اور اِس قدر طغیانی آئی کہ ظاہری حالات کے اعتبار سے یقین ہوگیا کہ جہاز اب غرق ہونے والا ہے،

میں چادر سے منھ لپیٹ کر بیٹھ گیا، ڈوبنے کے انتظار میں، اِسی اثناء میں مجھ پر غفلت طاری ہوئی، میں نہیں سمجھا کہ وہ نیند تھی یا غم کی بدحواسی؟ اِسی اثناء میں مجھ سے ایک شخص نے کہا کہ فلانے! اٹھو اور پریشان مت ہو، ہوا موافق ہوگئی ہے، کچھ دیر میں جہاز طغیانی سے نکل جاوے گا، اور میرا نام امداد اللہ ہے، مجھے میری کملی دو، میں نے گھبرا کر کملی دینی چاہی، اُس گھبراہٹ میں آنکھ کھل گئی، میں نے لوگوں سے کہا کہ تم مطمئن ہو جاؤ، جہاز ڈوبے گا نہیں، آخر جہاز طغیانی سے نکل گیا، اور ہم مکہ مکرمہ پہنچ گئے، اُس کے بعد میں نے لوگوں سے کہہ دیا کہ تم مجھے حاجی صاحبؒ کے بارے میں نہ بتانا، میں اُن کو خود پہچانونگا، میں طواف کر رہا تھا، حضرت حاجی صاحبؒ مطاف میں کھڑے تھے، میں نے فوراً پہچان لیا، کیونکہ اُن کی شکل اور لباس وہی تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔

میں طواف سے فارغ ہو کر حاجی صاحب سے ملا، اور کملی پیش کی، اور جہاز کا قصہ عرض کیا۔ اِس پر حضرت حاجی صاحب نے جو جواب دیا وہ بتانا مقصود ہے، حضرت نے فرمایا: بھائی! مجھے تو خبر نہیں، اللہ تعالیٰ بعض وقت اپنے کسی بندے کی صورت سے کام لے لیتے ہیں۔ (ارواح ثلثہ ص ۱۶۶)

یہ نہیں فرمایا کہ میں دعائیں کرتا تھا، میری دعا کا اثر تھا، میں نے توجہ ڈالی تھی، بلکہ جو بات دل میں تھی بر ملا اُس کا اظہار فرمایا۔

لطیفۂ غیبی:

حضرت تھانوی نے اِس واقعہ پر حاشیہ میں لکھا کہ حضرت کا یہ فرمانا "مجھے خبر نہیں الخ" اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جو نجات عطا فرمائی وہ

من جانب اللہ ایک لطیفۂ غیبی تھا، اور لطیفۂ غیبی عموماً کسی مانوس صورت میں متمثّل ہوتا ہے، یہ صاحب حضرت حاجی صاحب سے مانوس تھے، اِس لئے وہ لطیفۂ غیبی اُن کے لئے حضرت حاجی صاحب کی صورت میں ظاہر ہوا، نیز حضرت تھانوی نے فرمایا کہ: **بعض مرتبہ اللہ کے بعض برگزیدہ بندوں کو اُن حالات کی خبر بھی ہو جاتی ہے بطریقِ کرامت۔**

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہ حضرات اپنے لئے کسی ایسی چیز کے دعوی سے جو ان میں نہ ہو کوسوں دور تھے، بلکہ واقعی طور پر اپنے اندر پائے جانے والے کمالات کا اظہار بھی روانہ سمجھتے تھے۔

ظاہر وباطن کی یکسانیت سے آگے کا درجہ:

اِس سے بھی افضل درجہ یہ ہے کہ بندہ کا جہاں ظاہر صلاح وتقوٰی کے ساتھ متصف ہو باطن اُس سے زیادہ بہتر ہو، باطن کے لحاظ سے پاک طینت، نیک خصلت اور سلیم الطبیعت ہو، قلب میں باری تعالٰی کی خشیت راسخ ہو، خَلوت میں جَلوت کی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ حق تعالٰی شانہ کی نافرمانی سے بچنے کا اہتمام رکھتا ہو، حضور اکرم ﷺ دعا فرماتے تھے:

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِّنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً»

(ترمذی ج ۲ ص ۱۹۹ کتاب الدعوات)

کہ اے خدا! میرے باطن کو میرے ظاہر سے بہتر بنادے، اور میرے ظاہر کو بھی صالح بنادے۔

اِس لئے ہمارے اَسلاف اپنی ظاہری حالت کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ باطنی حالت کو سنوارنے کی زیادہ سعی فرماتے کیونکہ ظاہری حالت کو تو

لوگ دیکھتے ہیں، اندرونی حالات وکیفیات کو محض اللہ جانتا ہے، اِس لئے اندرونی حالت کی زیادہ فکر محض خشیتِ الٰہی اور سراپا صدق واخلاص کی وجہ سے ہوتی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کا اخفاءِ حال اور ایک مجذوب کا آپ کو پہچان لینا :

حضرت اقدس گنگوہیؒ کے حالات میں ہے کہ آپ حج کے لئے تشریف لے گئے، عمدہ لباس زیب تن کیا، اور طواف شروع کیا، مطاف کے کنارے پر ایک مجذوب بیٹھے ہوئے تھے، حضرت گنگوہی طواف کرتے ہوئے اُن مجذوب کے پاس سے گذرتے تو وہ کہتے ''اِلْبَسْ لِبَاسَ الصَّالِحِیْنَ'' صالحین کا لباس پہنو، حضرت طواف سے فارغ ہوکر ان مجذوب کے پاس آئے، اور عرض کیا کہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ ''اَلَیْسَ ھٰذَا لِبَاسَ الصَّالِحِیْنَ'' کیا یہ صالحین کا لباس نہیں ہے؟ میں نے کرتا پہنا ہے، یہ تو صالحین کا لباس ہے، پھر آپ کا مقصد کیا ہے؟ ان بزرگ نے فرمایا ''خَشِن خَشِن'' اور کھدر کا کرتا دکھایا، اور اشارہ کیا کہ اس طرح کا موٹا کپڑا پہنو۔

مطلب یہ کہ میں نے تمہارے قلب کی طرف توجہ کی، تو میں نے دیکھا کہ تمہارا باطن صالح ہے، اور تمہارے قلب کی حالت اونچی ہے، اور تم نے لباس عمدہ پہن کر اپنی اندرونی حالت کو چھپا رکھا ہے، تمہیں صالحین اور صوفیہ جیسا موٹا لباس پہننا چاہئے، تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اِن کے اندر کی حالت بہت ارفع ہے، لیکن جس نے مقصد محض رضاءِ باری تعالیٰ کو بنالیا ہو وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ناقص سمجھتا ہے، اور یہی عبدیت کا کمال ہے۔

صدق کے چاروں درجات پر مرتب ہونے والے ثمرات:

جب بندہ مقاماتِ صدق کی طرف وصول کرتا ہے، اور خدائی رہنمائی شاملِ حال ہو جاتی ہے، تو اُس پر صدق کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، اور اس کو اُن مقامات میں بتدریج پختگی حاصل ہوتی رہتی ہے، چنانچہ ابتدائی درجہ میں ان صفات کا صرف نام ہی نام ہوا کرتا ہے، البتہ انتہائی درجہ میں پہنچ کر سچا خوف اور سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

مقاماتِ صدق میں رسوخ سے بہت سے ثمرات من جانب اللہ عطا ہوتے ہیں، احقر کے ناقص غور و فکر کے مطابق ایسے بندہ کو بالخصوص دو صفتوں سے نوازا جاتا ہے:

(۱) شانِ استغناء کا حصول:

اول استغناء کی کیفیت کا حصول، جس کی دعا اس حدیث میں مانگی گئی ہے:

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْئَلُکَ الْغِنٰی عَنِ النَّاسِ»

(الحزب الاعظم بحوالہ العجالۃ فی احادیث المسلسلۃ لابی الفیض محمد یاسین الفادانی ج ا ص ۹۱)

اے اللہ! میں آپ سے سُوال کرتا ہوں لوگوں سے استغنا کا۔

اِس کی تفصیل یہ ہے کہ سچا خوف اور سچی محبت آجانے کے بعد بندہ اپنے افعال واحوال سے محض اللہ کی خوشنودی کا خواہاں ہوتا ہے، پھر وہ مخلوق کے نفع وضرر سے بے فکر ہو کر محض محتاجِ خدا ہو جاتا ہے، اور "اذعان ویقین" کے اس مرتبہ میں پہنچ جاتا ہے، جس کا مطالبہ اِس حدیث شریف میں کیا گیا ہے:

«وَاِذَا سَئَلْتَ فَاسْئَلِ اللّٰہَ، وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَا سْتَعِنْ بِاللّٰہِ، وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰی اَنْ یَّنْفَعُوْاکَ بِشَیْءٍ، لَمْ یَنْفَعُوْاکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ

اللّٰہُ لَکَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْءٍ، لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْءٍ قَدْ کَتَبَہُ اللّٰہُ عَلَیْکَ» الخ رواہ احمد والترمذی (مشکوٰۃ ص ۴۵۳)

کہ جب مانگو اللہ سے مانگو، مدد چاہو تو اللہ سے چاہو، اور اِس بات کا یقین دل میں بٹھالو، کہ اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع پہنچانا چاہیں تو نہیں پہنچا سکتے مگر وہی جو اللہ نے تمہارے حق میں لکھ دیا ہے، اِسی طرح اگر سب لوگ مل کر ضرر پہنچانا چاہیں، تو ضرر بھی نہیں پہنچا سکتے، مگر وہی جو حق تعالیٰ نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے۔

صدق سے متصف شخص کی مدح وذم سے بے نیازی :

اور چونکہ خدا کی بندگی سے مقصود محض خدا کی ذات ہو جاتی ہے، اِس لئے ایسا شخص اپنے علم و عمل اور اپنی عبادات وطاعات پر نہ مخلوق سے کسی صلہ وانعام کا طالب ہوتا ہے، اور نہ ہی اپنے لئے کسی کی تعریف کا متمنی ہوتا ہے، اور نہ اپنی تعریف پر خوش ہوتا ہے، اِسی طرح اگر کوئی شخص اُس کی برائی کرے تو اُس سے بھی متأ ثر نہیں ہوتا، مدح وذم اُس کے نزدیک برابر ہو جاتے ہیں۔

اِس نقطۂ نظر سے ہم اپنے اکابر میں سے جس کے احوال پر بھی نظر ڈالیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں، بالخصوص برگزیدۂ روزگار، امامِ ربانی حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی کو اِس سلسلے میں حق تعالیٰ شانہ نے صدیقین کے اُس مرتبہ پر پہنچایا تھا، اور وہ فنائیت عطا فرمائی تھی، جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

حضرت گنگوہی کا حضرت حاجی امداد اللہ سے اپنے حال کا تذکرہ:

حضرت حاجی صاحب نے مکہ مکرمہ سے حضرت گنگوہی کو خط لکھا کہ

دیگر متوسلین کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے، آپ کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا؟

شیخ کے اِستفسار پر عرضِ حال ضروری ہو گیا، اِس لئے حضرت گنگوہی نے اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے نام ایک خط میں اپنا ظاہری اور باطنی حال تحریر کیا، جس کا ہر حرف ہم جیسوں کے لئے نقشِ رہنما کی حیثیت رکھتا ہے، مکتوبِ گرامی کا مضمون یہ ہے:

حضرت مرشدِ من ! علمِ ظاہری کا تو یہ حال ہے کہ آپ کی خدمت سے دور ہوئے غالباً سات سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا ہے، اُس سال سے اب تک دو سو سے چند عدد زیادہ آدمی سندِ حدیث حاصل کر کے گئے، اور اکثر اُن میں وہ ہیں کہ اُنہوں نے درس جاری کیا، اور سنت کے اِحیاء میں سرگرم ہوئے، اور اشاعتِ دین اُن سے ہوئی، اور اس شرف سے زیادہ کوئی شرف نہیں اگر قبول ہو جائے۔

اور حضرت کے اقدامِ نعلین کی حاضری کے ثمرہ کا یہ خلاصہ ہے کہ جذرِ قلب (منتہائے قلب) میں غیرِ حق تعالیٰ سے نفع و ضرر کا التفات نہیں، واللہ بعض اوقات اپنے مشائخ کی طرف سے علیحدگی ہو جاتی ہے، لہٰذا کسی کی مدح وذم کی پرواہ نہیں رہی، اور معصیت کی طبعاً نفرت، اور اطاعت کی طبعاً رغبت پیدا ہو گئی ہے۔ (مکاتیبِ رشیدیہ ص ۱۰)

حضرت حاجی صاحب کا تأثر وارشاد:

حضرت حاجی صاحب کو یہ مکتوب ملا، اُس کے مضمون پر بے حد خوشی کا اظہار کیا، خصوصاً اِس میں جو یہ ایک فقرہ تھا کہ: ’’بندہ کو مدح وذم برابر ہیں‘‘ اِس پر فرمایا: یہ بہت بڑا مقام ہے، جو بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔

عزیزِ من: کہنے کو تو یہ دو لفظ ہیں، کہ مدح وذم برابر ہیں، مگر بخدا اِس کی تحصیل میں بہت عمریں ختم ہو گئیں، اور بجز معدودے چندے بہت کم لوگ کامیاب ہوئے۔ (باقیاتِ فتاویٰ رشیدیہ مقدمہ ص۸۹)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی اِس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے، کہ یہ غایت ہے تعلق مع اللہ کی، یعنی صدق واخلاص کی وجہ سے تعلق مع اللہ اِس قدر قوی ہو گیا، کہ اب لوگوں کی کچھ پرواہ نہ رہی، کوئی ہزار تعریف کرے نفس پھولتا نہیں، اور کوئی ہزار برائی کرے اس سے بھی طبیعت پر اثر نہیں ہوتا، چنانچہ حضرت کے احوال سے اور حضرت کے ساتھ اپنے اور پرایوں کے سلوک سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ حضرت کی نظر میں مادح وذام برابر ہیں، اوراُن چیزوں کی طرف التفات نہ فرماتے تھے۔

حضرت گنگوہی کی شانِ تحمل:

حضرت شیخ زکریاؒ کے والد حضرت مولانا یحیٰ صاحب حضرت گنگوہیؒ کو خطوط سنایا کرتے تھے، اخیر زمانہ میں حضرت کی بینائی جاتی رہی تھی، کرم فرماؤں کی طرف سے اہلِ بدعت کی طرف سے، حضرت کو گالی بھرے خطوط آتے تھے، حضرت نے ایک دفعہ کہا کہ مولوی یحیٰ! بہت دنوں سے تم نے کوئی خط نہیں سنایا، (کرم فرماؤں کا) کیا وہ خطوط آنا بند ہو گئے؟ حضرت مولانا یحیٰ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت خطوط تو آتے ہیں، لیکن میں سناتا نہیں ہوں، اُن میں گستاخی کی باتیں لکھی ہوتی ہیں، فرمایا کہ سناؤ، اُنہوں نے سنانے سے معذرت کی تو تاکیداً فرمایا کہ سناؤ، مولانا یحیٰ صاحب نے وہ خطوط سنائے، اُن میں گالیاں تھیں، اور گستاخانہ کلمات تھے، حضرت مسکرائے اور

فرمایا کہ ایک بزرگ نے فرمایا ہے کہ:

لوگ جن ہونٹوں سے ہمارے ہاتھوں کو چومتے ہیں، ہم منتظر رہتے ہیں کہ اُن ہونٹوں سے گالی کب دیں گے، کیونکہ جب ماسوٰی اللہ سے نفع وضرر کا التفات نہیں، اور کسی کی مدح وذم کی بھی پرواہ نہیں، تو اِس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کوئی ہاتھوں کو چومے یا گالی دے، جس بندے کی لوگوں سے توقعات ختم ہو جاتی ہیں، وہ مخلوق سے مستغنی وبے نیاز ہو کر خالق کے حکم کی بجاآوری کو سب تقاضوں پر مقدم رکھتا ہے۔

حضرت گنگوہی کی شانِ استغناء:

حضرت تھانوی نے حضرت گنگوہی کا حال تحریر فرمایا، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت کی مجلس میں کبارِ علماء بھی ہوتے، بڑے بڑے صاحبِ ثروت بھی ہوتے، بڑے عہدے داران بھی ہوتے، لیکن جوں ہی اپنے کسی معمول کا وقت ہوا، فوراً اُٹھ کھڑے ہوتے، اور اپنا معمول ادا فرماتے، اِس بارے میں کسی کا خیال نہ فرماتے، بادشاہِ وقت بھی اگر بیٹھا ہوا ہو، اُس کی بھی پرواہ نہ فرماتے۔

حضرت تھانوی نے اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا، کہ بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ نے اُن کو استغناء کی شان بخشی تھی، اِس لئے حقوق اللہ کی ادائیگی کے سلسلے میں اِس بات کی کوئی پرواہ نہ فرماتے کہ کون کیا کہے گا، کیا سوچے گا، یہ چیز ذہن سے نکل گئی تھی، مادح وذام یکساں ہو گئے تھے۔

(۲) صدق سے حبِ جاہ کا بھی ازالہ:

بندہ کو حق تعالیٰ شانہ کا قرب دو چیزوں سے حاصل ہوتا ہے، ایک اعمالِ

صالحہ، دوسرے اخلاقِ فاضلہ، یعنی قلب سے اخلاقِ رذیلہ نکل جائیں، اور ان کی جگہ اخلاقِ حسنہ پیدا ہو جائیں، اس کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی سالک کسی شیخِ کامل کی نگرانی میں اُن کی ہدایات کے مطابق ریاضت اور مجاہدہ اختیار کرے، بالخصوص ذکر پر دوام اختیار کرے، تو قلب کے رذائل، جیسے حسد، کینہ، عجب، تکبر، ریاء، وغیرہ کی جڑیں کمزور ہو کر وہ نکلنے لگتے ہیں، مولانا رومی نے فرمایا:

"ذکرِ حق پاک است چوں پاکی رسید رخت بر بند دبروں آید پلید"

کہ اللہ کا ذکر پاک ہے، جب بندہ اللہ کے ذکر کا اہتمام کرے گا، اور پاکی قلب میں پہنچے گی، تو قلب کی گندگی اور ناپاکی (رذائل) باہر آنے لگے گی، اور قلب مزکّٰی اور مصفّٰی ہونے لگے گا، پھر سالک ترقی کرتے کرتے جب مقاماتِ صدق میں قدم رکھتا ہے، تو رذائل ختم ہو کر قلب میں تجلّی کی صفت پیدا ہو جاتی ہے، اور قلب مزکّٰی اور مصفّٰی ہو جاتا ہے، البتہ رذائل میں حبِ جاہ کا رذیلہ نہایت خطرناک ہے، قلب میں اُس کی جڑ بہت مضبوط ہوتی ہے، مگر صدق کے برکات و ثمرات کے نتیجہ میں یہ رذیلہ بھی صدیقین کے قلب سے زائل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ رذیلہ ہے جو قلب سے سب سے اخیر میں نکلتا ہے، مشائخِ سلوک نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور آئندہ واقعہ سے بھی اس کی وضاحت ہوگی۔

شاہ عبدالرحیم رائپوری کی تلاشِ شیخ:

حضرت شاہ عبد الرحیم رائپوری اولاً شاہ عبد الرحیم ولایتی (جن کو

سہارنپوری بھی کہا جاتا ہے) سے بیعت ہوئے تھے، اوران سے خلافت بھی حاصل ہوگئی تھی۔ شاہ عبدالرحیم ولایتی کی قبر سہارن پور میں ہی ہے، وہ اُمی تھے پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن بڑے کشف و کرامات والے تھے، لوحِ محفوظ کی باتیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتیؒ کی وفات ہوگئی، تو شاہ عبدالرحیم رائپوری کو اب شیخ کی تلاش شروع ہوئی، کہ اپنا اصلاحی تعلق کسی سے قائم کریں، بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

ہمارے سلسلۂ چشتیہ میں، حضرت صابر کلیری سلسلۂ چشتیہ کے بڑے مشائخ میں سے ہیں، اِس لئے حضرت رائپوری شیخ صابر کلیریؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور وہاں چند دن رہے، نماز کے اوقات میں نماز پڑھتے اور باقی اوقات حضرت کی قبر کے پاس مراقب رہتے، کئی روز وہاں قیام کیا۔

خواب میں حضرت گنگوہیؒ کی جانب رہنمائی :

ایک مرتبہ ایسا ہوا، کہ باہر سوئے ہوئے تھے، گرمی کا موسم تھا، اچانک ایسا محسوس ہوا کہ بارش آئی، بوندیں آرہی ہیں، بستر اٹھاکر برآمدے میں لے آئے، جب برآمدے میں آئے، تو دیکھا کہ بارش نہیں ہے، کیونکہ گرمی تھی اِس لئے جب یہ دیکھا کہ بارش نہیں ہے، تو پھر باہر آگئے، اور بستر باہر بچھا لیا، اور لیٹ گئے، آنکھ لگی تو پھر یہی محسوس ہوا کہ بارش آرہی ہے، اِس لئے پھر بستر اٹھایا، اور برآمدے میں آگئے، کئی مرتبہ ایسا ہی ہوا، حالانکہ حقیقۃً کوئی بارش وغیرہ نہیں تھی، آنکھ کھل گئی، اُس کے بعد سوئے نہیں، مراقب ہوگئے حضرت کی قبر کے پاس، مراقبہ کے دوران آواز ائی، کہ اب ہمارے

سلسلے کا نور گنگوہ میں ہے، وہاں جایئے، چنانچہ حضرت گنگوہی کے پاس آئے، اور عرض کیا میں آپ کے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہتا ہوں۔

حضرت رائپوری میں خلوصِ ارادت:

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا کہ شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری کو حضرت شاہ عبد الرحیم ولایتی کی طرف سے اجازت و خلافت بھی حاصل ہو گئی تھی، اور کچھ لوگ اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی ہو گئے تھے، لیکن چونکہ مخلص تھے اِس لئے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں تو شیخ سے اجازت و خلافت حاصل ہو گئی، ہماری اصلاح مکمل ہو گئی، اب ہمیں کسی سے اصلاح کرانے کی ضرورت نہیں، بلکہ باوجود پہلے شیخ کی طرف سے اجازت و خلافت کے اپنے حق میں رہنمائی کی ضرورت محسوس کی۔

بہر حال شیخ کی تلاش شروع ہوئی، اور حضرت گنگوہی کے یہاں گئے، اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ حضرت میں بیعت ہونے کے لئے آیا ہوں، حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ تم تو پیر صاحب ہو، تمھیں بیعت کی کیا ضرورت ہے؟ فوراً تنبہ ہوا، واپس آئے، اور جن لوگوں کو بیعت کر رکھا تھا، اُن کی بیعت ختم کی پھر حضرت گنگوہی کے پاس گئے، اور حضرت سے بیعت ہوئے، وہاں حضرت کی نگرانی اور سرپرستی میں ایک لمبا عرصہ گزارا، اور حضرت کی طرف سے بھی مُجاز ہوئے۔

حضرت گنگوہی کے یہاں حبِ جاہ کا سر قلم پایا:

اِسی پسِ منظر میں حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری سے کسی نے

پوچھا، آپ کے پہلے شیخ حضرت شاہ عبد الرحیم ولایتیؒ تھے، پھر آپ نے حضرت گنگوہیؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اور اُن کو اپنا پیرومرشد بنایا، تو دونوں پیروں میں آپ نے کیا فرق پایا؟ یہ نازک سوال کسی نے حضرت شاہ عبد الرحیم رائپوری سے کیا، اِس پر حضرت رائپوری نے یہ اہم جملہ کہا کہ: ”دوسرے پیر کے یہاں حبِ جاہ کا سر قلم پایا“ کیونکہ حضرت اقدس گنگوہی کو صدیقیت کا بلند مقام عطا ہوا تھا، اور صدیقین کا قلب حبِ جاہ کے رذیلہ سے پاک وصاف ہوتا ہے۔

حضرت گنگوہی کو اللہ نے بہت بڑی شان عطا کی تھی، آپ امامِ ربانی تھے، آپ نے جہاں علمِ ظاہر کے چشمے بہائے، وہیں سلوک وتصوف کو سنت کے ڈھانچے میں ڈھالنے کا بڑا فریضہ انجام دیا، چنانچہ مدارس اور مکاتب کا موجودہ سلسلہ بھی درحقیقت حضرت گنگوہیؒ کی ہی توجہاتِ باطنی اور آپ کی دعاؤں کا ثمرہ ہے، نیز آپ نے ہی تصوف کو اُن بدعات سے پاک کیا، جو جاہل لوگوں نے اس میں داخل کرلی تھیں۔

حضرت گنگوہی کے بارے میں شاہ عبد الرحیم ولایتی کا تأثر:

شاہ عبد الرحیم ولایتی اُمی تھے، جیسا کہ اوپر گذرا، اُن سے کسی نے کہا کہ حضرت! یہ جو آیت ہے:

﴿يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (القارعۃ:۴-۵)

اس کا کیا مطلب ہے؟ اُمی تھے، پڑھے ہوئے نہیں تھے، کہا کہ میں تو پڑھا ہوا نہیں، باقی میرے ذہن میں اِس کا مطلب کچھ ایسا آتا ہے، کہ

قیامت کے دن یہ پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے، مطلب صحیح بتایا، اُمی تھے پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن بات یہ ہے کہ ریاضت اور مجاہدہ سے قلب میں جلاء آجاتا ہے، اور جب قلب مزکیٰ و مصفیٰ ہو جاتا ہے، تو اُس قلب پر من جانب اللہ علوم کا فیضان ہونے لگتا ہے۔

بہرحال حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی نے بتایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، لیکن اِس کا مطلب کچھ ایسا سمجھ میں آتا ہے، کہ قیامت کے دن یہ پہاڑ دھنی ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے، باقی تم ایسا کرو کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اِس کا مطلب معلوم کرو سائل نے کہا کہ حضرت وہ اُس کا مطلب جانتے ہیں، تو فرمایا ارے واہ، اُن کا کیا کہنا، اُن کا قلم عرش کو دیکھ کر چلتا ہے۔

حضرت گنگوہی کے بارے میں سائیں توکل شاہ کا تأثر:

انبالہ کے رہنے والے ایک مشہور بزرگ سائیں توکل شاہ تھے، جو مجذوب تھے، وہ بھی پڑھے لکھے نہیں تھے، حضرت گنگوہی نے جب کوّے کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا، تو مخالفین نے حضرت پر اعتراض کیا، سائیں توکل شاہ سے کسی نے بطور اعتراض کہا، کہ جی مولانا گنگوہی نے کوّے کو حلال کہا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟ سائیں توکل شاہ نے فرمایا: کہ تم اُن پر اعتراض کرتے ہو، میں نے اُن کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مسندِ افتاء پر فائز دیکھا ہے، حضرت گنگوہی خود بھی یہ بات فرماتے تھے، کہ خواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ممبر پر کھڑا کیا، مجھ سے (۱۰۰) مسئلے دریافت فرمائے، میں نے فقہ حنفی کے مطابق سب کا جواب دیا، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فتویٰ لکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ (ملفوظاتِ فقیہ الامت ج۳ص۲۰۷)۔

انسان جاہ کا طالب کیوں؟

جاہ کی محبت انسان کے قلب میں ہونے کا راز یہ ہے کہ انسان یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے قلوب پر اُس کا قبضہ ہو جائے، لوگوں کے دل میرے مطیع بن جائیں، تاکہ لوگ میری حاجت کے پورا کرنے میں لپکیں اور سبقت کریں۔

مال کے ساتھ بھی انسان کو اِسی غرض سے محبت ہوتی ہے، کہ وہ رفعِ حاجت کا ذریعہ ہے، اور جاہ و منصب سے مال بھی بآسانی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن مال سے جاہ کا حصول ضروری نہیں، اِس لئے طلبِ جاہ کی جڑ قلب میں زیادہ مضبوط اور پختہ ہوتی ہے، لیکن بندہ کا جب تعلق مع اللہ قوی ہو جائے، اور مخلوق سے نفع و ضرر کا التفات نہ رہے، تمام حاجات کی بر آری من جانب اللہ ہونے کا یقین قلب میں جاگزیں ہو جائے، تو پھر جاہ و شہرت کی طلب بھی دل سے نکل جاتی ہے، اِسی لئے مشائخ نے لکھا کہ قلب سے سب سے آخر میں حبِ جاہ نکلتا ہے۔

حب جاہ کا سبب اور اُس کا علاج امام غزالی کے کلام سے :

یہاں حبِ جاہ کا تذکرہ آیا، جو رذائل میں بڑا رذیلہ ہے، اُس کے نتائج نہایت خطرناک ہیں اور سالک کے لئے وصول الی اللہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔

لہٰذا اِس موقعہ پر تتمیمًا للبحث مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس رذیلہ کا منشاء اور سبب کی وضاحت کردی جائے اور اس کا علاج بھی بتادیا جائے، یہ دونوں چیزیں ہم یہاں امامِ غزالی کے کلام سے ملخّصًا نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

حبِ جاہ کے بکثرت ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے، کہ ہر آدمی کو اپنی بڑائی اور عزت کی بالطبع خواہش ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں یکتائے روزگار بن جاؤں۔

حالانکہ یہ (یکتائے روزگار ہونا) حقیقتِ الٰہیہ ہے، کیونکہ یکتائی اُسی کی شان ہے، نیز یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے قلوب کے اعتبار سے میرے مطیع وفرمانبردار بن جائیں، کہ میری عظمت وبڑائی کے معتقد ہو کر مجھ کو صاحبِ کمال سمجھنے لگیں، ہاتھ باندھے ہوئے میری تعظیم کریں، اور میری شہرت کا آوازہ اُن ملکوں تک پہنچ جائے جہاں میں خود نہیں پہنچ سکتا۔

اس کا علاج یہ ہے کہ اِس بات کا اِستحضار کیا جائے، کہ انسان ایک دن مرنے والا ہے، اور جاہ وشہرت مرنے کے بعد ختم ہو جائیگی، پس اگر یہ ناپائدار شہرت حاصل بھی ہوئی، اور مخلوق میں عزت وجاہ بھی مل گئی، تو کیا ہوا؟ یہ تو کوئی خوبی اور کمال کی بات نہیں، کمال تو ایسی چیز کا حاصل کرنا ہے، جس میں موت کوئی خلل یا کمی نہ پیدا کرے، اور وہ معرفتِ الٰہی ہے، کہ صاحبِ معرفت شخص دنیا سے انتقال بھی کر جائے، تب بھی معرفت کے بے شمار مراتب میں اُس کی ترقی رہتی ہے، لہٰذا اِس رعونت اور طلبِ شہرت کا علاج کرو، اور اُس کی محبت دل سے نکالو، یوں سمجھو کہ اگر مثلاً تمام دنیا تم کو سجدہ بھی کرنے لگے، تو کتنے دن کے لئے؟ آخر ایک دن وہ ہو گا کہ نہ تم باقی رہو گے اور نہ سجدہ کرنے والے باقی رہیں گے۔

تعجب ہے کہ زمانہ تو تمھارے ساتھ یہاں تک بخل کرتا ہے، کہ شہر یا قصبہ تو درکنار تمھارے محلہ پر بھی تم کو پورا قبضہ نہیں دیتا، اور تم زمانہ کی

ہمدردی میں ایسے ڈوبے، کہ دائمی نعمت اور جاوید سلطنت چھوڑنے پر راضی ہوگئے، کہ دنیا کی اِس مکدّر و حقیر شہرت اور چند ایسے احمق و ضعیف لوگوں کی تعظیم و تکریم پر نازاں ہو گئے جن کو نہ کسی کی موت و حیات کا اختیار ہے اور نہ کسی کے ضرر اور نفع پر دسترس ہے، اور اِس کی بدولت اُس پائدار عزت اور عالمِ ملکوتی کی شہرت کو کھو بیٹھے جو حق تعالٰی اور اُس کی برگزیدہ و پاک مخلوق یعنی فرشتوں میں تم کو حاصل ہوتی ہے۔ (تبلیغِ دین ص ۱۳۵)

صدق کے مذکورہ درجات کے حصول کی ترتیب :

درجاتِ صدق میں ابتدائی اور بنیادی درجہ صدق فی اللسان کا ہے، اُس پر محنت کرنے سے اور ہمیشہ سچ بولنے کا اہتمام کرنے سے صدق کے باقی درجات کی طرف وصول آسان ہو جاتا ہے، کیونکہ ما قبل میں بتایا جاچکا کہ ویسے تو اعضاء کے تمام ہی کاموں کا اثر قلب پر پڑتا ہے، مگر زبان چونکہ قلب کی سفیر ہے، دل جس چیز کا تصور کرتا ہے، اُس کا اظہار زبان ہی کیا کرتی ہے اِس لئے اُس کی تاثیر قلب پر زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

اِس لئے جب صدقِ لسان کا التزام کیا جاتا ہے، تو صدق کی عظمت واہمیت قلب پر منکشف ہونے لگتی ہے، پھر بندہ اپنے افعال واحوال سے بھی اللہ کی رضاوخوشنودی کو ڈھونڈنے لگتا ہے، پھر بتقاضائے حدیث:

”جو بندہ ہماری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے، ہم اس کی طرف دو ہاتھ بڑھتے ہیں“۔

اِس لئے بندہ کی اِس طلب پر توفیقِ الٰہی اُس کی مدد کرتی ہے، اور وہ ترقی کرتے کرتے صدق کے سب ہی درجات کو بتدریج حاصل کر لیتا ہے،

حدیث شریف سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی اور بنیادی درجہ صدقِ لسان کا ہے اُسی کے التزام سے صدق کی دیگر راہیں کھلتی ہیں، اور اُسی سے آگے کی منزل نظر آتی ہے، وہ حدیث پہلے بھی گذر چکی ہے: کہ بندہ سچ بولتا ہے اور قدم قدم پر سچ کو تلاش کرتا رہتا ہے، تو اُسے اللہ کے یہاں صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔

یعنی اُس شخص کو صدق کے باقی درجے بھی حاصل ہو جاتے ہیں، اِس لئے عند اللہ وہ صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔

حصولِ صدق کے لئے ہمت ضروری:

حق تعالٰی شانہ نے انسان کی ترقی کے لئے انسان کے اندر ایک چیز پیدا فرمائی ہے، وہ ہے "ہمت"، یہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، یہ ربڑ کی طرح ہے، اگر ربڑ کو تم کھینچو گے، تو وہ کھنچتی چلی جائیگی، اِسی طرح انسان کے اندر جو ہمت ہے، اُس کو اللہ تعالٰی نے ایسا بنایا ہے، کہ اُس کو جتنا چاہو کھینچ لو، اور اونچے سے اونچے مقام تک پہنچ جاؤ، اِس دنیا کے اندر جس شخص نے بھی کوئی کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اِسی ہمت کی بنا پر انجام دیا ہے چاہے وہ دنیا کا کارنامہ ہو یا دین کا کارنامہ۔

چنانچہ شریعت میں جتنے بھی اعمال ہیں، چاہے وہ ایجابی ہوں جیسے اوامر کو بجالانا، یا سلبی ہوں، جیسے نواہی سے بچنا، اُن سب میں ہمت کے استعمال کی ضرورت ہے، جب ہمت سے کام لے گا، تو وہ کام ہوگا، ورنہ وہ کام نہیں ہوگا، لہٰذا صدق کی تحصیل کے لئے بھی ہمت کو استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔

ہمت؛ خلاصۂ تصوف :

انفاسِ عیسیٰ میں حضرت اقدس تھانوی کا قول نقل کیا گیا ہے کہ: اخلاص وہمت خلاصۂ تصوف ہیں، اِن دونوں میں بھی اصل چیز ''ہمت'' ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے لئے بھی ہمت ہی کی ضرورت ہوگی، یعنی اخلاص کے ساتھ عملِ صالح کرنے کی اور گناہوں سے بچنے کی ہمت ہو، تصوف کا خلاصہ یہی ہے، اگر یہ دونوں چیزیں پیدا ہو گئیں، تو سمجھو کہ منزل حاصل ہو گئی۔

یہ بات حکیم الامت کہہ رہے ہیں، جو اِس میدانِ تصوف کی خاک چھاننے کے بعد اپنی پوری زندگی کے تجربات کا، اپنے علم ومعرفت کا، اپنی ریاضت ومجاہدات کا نچوڑ بتارہے ہیں کہ دو چیزیں حاصل کرنے کی ہیں: ایک ''اخلاص'' اور دوسرے ''ہمت''۔

پھر آگے فرمایا کہ اِن دونوں چیزوں میں بھی اصل ہمت ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے لئے بھی ہمت ہی کی ضرورت ہوتی ہے، اخلاص بھی ہمت کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، مثلاً انسان جب نماز پڑھنے کے لئے جاتا ہے، تو اب نفس وشیطان اُس کے دل میں ایک چرکہ لگاتے ہیں، کہ آج جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو گا، اور لوگ تجھے دیکھیں گے ،تو تجھے متقی پرہیز گار اور بڑا عابدوزاہد سمجھیں گے، چنانچہ ممکن ہے کہ وہ خود بھی لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنی نماز میں اور زیادہ خشوع وخضوع پیدا کرے، اب نفس وشیطان نے لوگوں کو دکھانے کی جو بات دل میں ڈالی ہے، اُس سے نجات کے لئے بھی ''ہمت ''کی ضرورت ہے، اور وہ ''ہمت ''یہ ہے کہ دل میں یہ سوچ کہ اِس

مخلوق کو چھوڑو، اِس لئے کہ مخلوق کی تعریف، اور مخلوق کی مذمت کا کیا اعتبار، اگر یہ خوش ہو جائیں تو کیا؟ اور برائی کریں تو کیا؟ یہ سب فانی چیزیں ہیں، اِس سے آخرت کا کچھ بھلا نہ ہو گا، اِس طرح سوچ کر دکھاوے کا جو خیال دل میں آیا تھا اُس کو نکالے، لیکن اِس کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہے۔

دعا کا اہتمام بھی ضروری :

اور چونکہ سب کچھ اللہ کے فضل اور اُس کی توفیق سے ہوتا ہے، اِس لئے ہمت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ سے اِن صفات کے حاصل ہونے کی دعا بھی کرتا رہے، حضرت تھانوی نے ہی فرمایا کہ دعا سے سبب اور تدبیر میں برکت ڈالدی جاتی ہے، مأثور دعاؤں میں درج ذیل دعا حق تعالیٰ شانہ سے اپنی اصلاح چاہنے کے لئے اور خاص طور پر صفاتِ صدق عطا ہونے کے لئے نہایت جامع اور مفید ہے، وہ دعا یہ ہے:

«اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی، مِنَ الْقَوْلِ، وَالْعَمَلِ، وَالْفِعْلِ وَالنِّیَّةِ، وَالْھُدٰی، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ» (الحزب الاعظم بحوالہ کنز العمال ج ۲ ص ۲۰۹)

اِس میں حق تعالیٰ شانہ سے دعا مانگی گئی، کہ مجھے توفیق عطا فرما، ایسے قول وعمل کی، اور ایسی نیت کی، جو تیری رضا کے مطابق ہو، اور مجھے ہدایت عطا فرما، اور ظاہر ہے کہ اللہ کی رضا کے مطابق وہ قول اور عمل ہے اور وہ نیت ہے، جس میں صدق ہو، اخلاص ہو۔

اس دعا میں لفظِ قول سے صدق فی اللسان کی، اور لفظِ فعل وعمل سے صدق فی الافعال کی، اور لفظِ نیت سے صدق فی الجَنان کی دعا مانگی گئی ہے،

اور لفظِ ھدٰی عام ہے، یہ صدق فی الاحوال کو بھی شامل ہے، اور صدق کے اُن درجات کو بھی جو اِس سے پہلے مذکور ہوئے، پس یہ تعمیم بعد التخصیص کے قبیل سے ہے۔

اِس دعا کے ترجمہ اور مفہوم سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ شانہ سے صفاتِ صدق کی دعا و درخواست کے سلسلے میں یہ دعا نہایت اہم اور جامع ہے۔

پس بندہ کو چاہئے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرے، قلب سے اخلاقِ رذیلہ کو نکالنے کے لئے ریاضت اور مجاہدہ کرے، ''صدق'' جس پر دونوں جہاں کی کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے، اُس کے حصول کے لئے ہر ممکن سعی کرتا رہے، اور اُس کے لئے حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ میں تضرع والتجا کرتا رہے، بالخصوص جو دعا ذکر کی گئی، اُس کو اہتمام سے پڑھے، بندہ کی اِن عاجزانہ کوششوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت متوجہ ہوگی، اور اِن صفات کے حصول میں کامیابی ملے گی۔

حق تعالیٰ شانہ اپنی رضا والے اعمال واخلاق عطا فرمائے، اور اپنی پسندیدہ صفات سے متصف فرمائے۔

صدق کے چار درجات کی یہ تشریح مکمل ہوئی، ان چاروں درجات کے حاصل ہوجانے کے بعد ہی انسان ''صدیقین'' کے زمرہ میں شمار ہوگا، شیخ یونس صاحبؒ کی شان بہت اونچی تھی، اِن درجات کی تشریح، اگر خود حضرت فرماتے تو بات کچھ اور ہوتی، لیکن اہلِ دانش کے یہاں اصول ہے:

«مَالَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ»

کہ اگر کوئی شئ پورے طور پر حاصل نہ کی جاسکے، تو اُس کا جتنا حصہ

حاصل کرنا ممکن ہو غنیمت سمجھ کر اُسی کو حاصل کرلیا جائے، نیز بڑوں کے علمی و عملی اِفادات کو آگے بڑھانا چھوٹوں کا کام ہوتا ہے، اِس لئے اِس احقر نے اِس طرف توجہ کی، چنانچہ بعض آیات واحادیث میں غور کرکے، اور اکابر کے احوال وکیفیات پر نظر کرکے اُن کی روشنی میں اپنے ناقص علم اور فہم کے مطابق اپنی بِساط بھر، درجات صدق کی تشریح کی، حق تعالیٰ شانہ اس کو خود میری اصلاح کا ذریعہ بنائے، اور ناظرین کے حق میں بھی نافع بنائے۔

حضرت شیخ یونس پر فکر آخرت کا غلبہ اور اپنے لئے ایصال ثواب کی وصیت:

ہمارے اکابر میں سے ہر ایک ہمارے لئے آفتاب وماہتاب کا درجہ رکھتا ہے، ہر ایک میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اُن کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں، شیخ یونس صاحب کی عمومی و خصوصی بہت سی مجلسیں پائیں، حضرت پر فکرِ آخرت کا بہت غلبہ تھا، قلب خشیتِ الٰہی سے معمور تھا، اللہ کی شانِ بے نیازی کا اکثر تذکرہ فرماتے، اور ہمیشہ لرزاں وترساں رہتے تھے، زبان پر اکثر استغفار رہتا تھا۔

حضرت کے ملفوظات میں ہے، کہ ایک مرتبہ (خدام کو خطاب کرکے) کہا کہ تم گواہ رہنا، میں اپنے سب گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔

موقعہ بموقعہ اپنے تعلق والوں کو اپنے لئے اِیصالِ ثواب کی تاکید بھی فرماتے۔

حضرت کی وفات سے چندماہ قبل میرا عمرہ کا سفر تھا، سفر شروع کرنے سے پہلے، احقر اطلاع دینے کے لئے، اور دعا لینے کے لئے، حاضر خدمت ہوا، اور عرض کیا کہ حضرت! میرا عمرہ کا ارادہ ہے، تو حضرت بے اختیار

روتے لگے، اور فرمایا: اِسی مجلس میں مجھ سے وعدہ کرو، کہ میرے مرنے کے بعد ثواب پہنچایا کروگے، احقر نے اس کا وعدہ کیا، اور عرض کیا کہ حضرت! میں (اس سفر میں) آپ کے لئے عمرہ بھی کرونگا۔

چنانچہ بندہ نے ایک عمرہ جعرّانہ سے احرام باندھ کر کیا، اور اس میں حضرت ہی کو ثواب پہنچانے کی نیت کی۔

ہندوستان واپسی ہوئی، تو حضرت کو بتایا کہ جعرانہ سے احرام باندھ کر آپ کے لئے میں نے عمرہ کیا، حضرت بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں، حق تعالیٰ شانہ حضرت کے درجات بلند فرمائے، اور ہم سب کی طرف سے جزائے خیر دے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

مجلس (۵)

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعَالَمِيۡنَ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيۡرِ خَلۡقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ اَجۡمَعِيۡنَ۔ اَمَّا بَعۡدُ

اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطَانِ الرَّجِيۡمِ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوۡنُوۡا مَعَ الصّٰدِقِيۡنَ﴾ (التوبۃ:۱۱۹)

حصولِ صدق کے لئے صادقین کی معیت کیوں ضروری ہے؟

اِس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالٰی نے اپنے بندوں کو دو حکم دئے ہیں، ایک یہ کہ تقویٰ اختیار کرو، دوسرے یہ کہ صادقین کی معیت اور صحبت اختیار کرو، اُن کی صحبت میں رہنے سے تمھارے اندر تقویٰ بھی آجائے گا، اور صفاتِ صدق بھی حاصل ہو جائیں گی۔

اِس آیت میں غور کرنے کی چیز یہ ہے، کہ بندہ کے اندر تقویٰ اور صدق پیدا ہونے کے لئے حق تعالٰی شانہ نے صادقین کی صحبت اٹھانے کا حکم دیا، یہ صورت اختیار نہیں کی کہ تقویٰ اور صدق کی تشریح پر مشتمل، ایک بلیغ مضمون بیان کرکے کہہ دیا ہو، کہ یہ تقویٰ ہے، یہ صدق ہے، یہ اسکے درجات ہیں، اِن کو اپنے اندر پیدا کرلو، بلکہ اللہ کے جو برگزیدہ بندے، اِن صفات سے متصف ہیں، اُن کی معیت اختیار کرنے کا حکم دیا، وجہ اُس کی یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے، کہ اُس کی تعلیم وتربیت محض

کتابوں، اور روایتوں سے، اور مضامین پڑھنے اور سننے سے نہیں ہو سکتی، بلکہ اُن صفات کے رِجالِ ماہرین کی صحبت اور اُن سے سیکھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔

چنانچہ سرکار دوعالم محمدِ مصطفیٰ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے وقت سے لے کر آج تک جو دین آیا ہے وہ سچے لوگوں کی صحبت سے آیا ہے، صادقین کی صحبت سے آیا ہے۔

صحابہؓ کو دین کس طرح حاصل ہوا؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں رہے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی صحبت اٹھائی، آپ علیہ السلام کے اقوال، افعال واحوال کو دیکھا، اِس سے اللہ نے ان پر دین کا رنگ چڑھادیا، ایسا رنگ چڑھایا کہ آسمانوں وزمین کی نگاہوں نے دین کا ایسا چڑھا ہوا رنگ نہ اُس سے پہلے کبھی دیکھا، نہ اُس کے بعد کبھی دیکھ سکے گی، وہ لوگ جو دنیا کے معمولی معمولی معاملات پر جان دینے کو تیار ہو جاتے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جاتے تھے، اُن کی نظروں میں دنیا ایسی بے حقیقت اور ذلیل ہوئی، کہ وہ اللہ کے احکام کے آگے ساری دنیا کے خزانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

انسانی قوتوں کے کام کے لئے خارجی ماحول کا موافق ہونا ضروری :

صحبت ضروری اِس لئے ہے کہ انسان کی جِبِلّت اور نفسیات سے واقف حضرات اِس بات کو جانتے ہیں، کہ حق تعالیٰ شانہ نے انسان کے اندر جو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں، وہ اپنا کام اُس وقت کرتی ہیں جب خارج کا ماحول اُن کے موافق ہو، اور اُس موافق ماحول سے اُن قوتوں کو مدد ملے، اِس کے بغیر انسان کی قوت اپنے عمل سے معطّل رہتی ہے، مثلاً حق تعالیٰ شانہ نے ہمیں قوتِ بینائی

عطا فرمائی، ہماری آنکھ میں نور پیدا کیا ہے، آنکھ کے اِس نور سے ہم کائنات کا اور مخلوقاتِ خداوندی کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن آنکھ کا نور اُسی وقت اپنا کام کرتا ہے جب خارجی ماحول موافق ہو، یعنی سورج نکلا ہوا ہو، اور سورج کی روشنی قائم ہو، جب آنکھ کے نور کو سورج کے نور سے تقویت ملتی ہے تو ہم اپنی آنکھ سے بہت ساری چیزیں دیکھتے ہیں، بیوی کو بھی دیکھتے ہیں، رشتہ داروں کو بھی دیکھتے ہیں کائنات میں بنی ہوئی بہت سی چیزوں کو دیکھتے ہیں، جب تک سورج کی روشنی باقی رہتی ہے، اُس وقت تک آنکھ کا نور ہمیں بہت سی چیزوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔

لیکن جب شام ہو جاتی ہے، اور سورج غروب ہو جاتا ہے، اور اندھیرا چھا جاتا ہے، تو کچھ نظر نہیں آتا، دن میں جب سورج نکلا ہوا تھا، تو کمرے میں رکھی ہوئی سب چیزیں نظر آرہی تھیں، یہاں کتاب رکھی ہوئی ہے، یہاں قلم رکھا ہوا ہے، یہاں تپائی رکھی ہوئی ہے، یہاں چٹائی رکھی ہوئی ہے، یہاں فلاں چیز ہے۔ سب چیزیں آنکھ کی روشنی سے نظر آتی ہیں، جب رات ہو گئی، اور کمرے میں لائٹ نہیں ہے اندھیرا ہے تو کچھ نظر نہیں آتا، ایسے ہی ہم اندھیرے میں دیواروں کو پکڑ پکڑ کر چلتے ہیں، کمرے کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، تو سُوال یہ ہے کہ دن میں آنکھ کی روشنی سے نظر آرہا تھا، وہ آنکھ کی روشنی رات میں بھی باقی ہے، ہمارے جسم میں آنکھ موجود ہے، سورج کے غروب ہو جانے کے بعد آنکھ میں کوئی خلل نہیں آیا، کوئی آفت لاحق نہیں ہوئی، بیماری لاحق نہیں ہوئی، آنکھ جس طرح دن میں صحیح سالم ہے، اندھیرا ہو جانے کے بعد بھی وہ صحیح ہے، دن میں سورج کی روشنی کے ساتھ آنکھ

دیکھتی ہے، اور غروب ہونے کے بعد آنکھ سے نظر نہیں آرہا ہے، حالانکہ روشنی باقی ہے، تو یہ فرق کیوں ہوگیا؟

اِس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے آنکھ میں جو بینائی کی قوت رکھی ہے، اُس قوت سے اُس وقت تک کام نہیں لیا جا سکتا جب تک خارج کا ماحول موافق نہ ہو، اور خارج سے اُس کو مدد نہ ملے، غروبِ شمس کے بعد ماحول خلاف ہوگیا، اِس لئے سخت اندھیرے میں وہ قوت کام نہیں کرتی، لیکن اگر کمرہ میں بجلی کی روشنی کردی جائے، یا چراغ جلا دیا جائے تو آنکھ کے نور کو اُس خارجی نور سے مدد مل جائے گی، اِس لئے پھر کمرہ کی اَشیاء نظر آنے لگیں گی۔

قوتِ عملیہ سے استفادہ کے لئے صالح ماحول ضروری :

یہی حال انسان کی قوتِ عملیہ کا ہے، حق تعالیٰ شانہ نے انسان کو عقل وبصیرت دی ہے، اُسی کے ساتھ قوتِ عملیہ بھی عطا فرمائی ہے، اِس قوت میں یہ صلاحیت ہے کہ بندہ اُس کو اللہ کی رضا کے کاموں میں استعمال کرے، تو ترقی کرتے کرتے ملائکہ سے بھی آگے نکل سکتا ہے، لیکن انسان کی تخلیق میں چونکہ قوتِ بہیمیہ کا عُنصر بھی شامل ہے، اِس لئے جب تک خارج کا ماحول موافق نہ ہو، اور جب تک اُس قوت کو مہذب نہ بنالیا جائے، اُس وقت تک یہ قوت اپنا پورا کام نہیں کرتی، کیونکہ خارجی ماحول کا اثر پڑتا ہے، پس اگر معاشرہ صالح نہ ہو، یا آدمی کے مجالسین ومصاحبین صلاح وتقویٰ والے نہ ہوں، تو قوتِ بہیمیہ غالب آکر آدمی کو خواہشاتِ نفس میں محو ومستغرق کردیتی ہے۔

اِسی لئے انسان کو اپنی فطرت کے لحاظ سے کوئی معلِم ومربی چاہیے جب تک

کسی معلمِ و مربی سے تربیت نہ پائی ہو، اُس کی صحبت نہ اٹھائی ہو، اُس کا عملی نمونہ نہ دیکھا ہو، اُس وقت تک انسان کو عملی کمال حاصل نہیں ہوتا، یہی راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے تنہا کتاب نہیں بھیجی، بلکہ اِنزال کتب کے لئے انبیاء علیہم السلام کو واسطہ بنایا گیا، اِس لئے کہ اگر محض کتاب دی جاتی، تو انسان کے اندر اتنی قابلیت نہیں تھی کہ اُس کتاب کے ذریعہ اصلاحِ نفس کرلے، اِس لئے معلم بھی ساتھ بھیجا، تربیت دینے والا بھی بھیجا، کیونکہ جب تک تعلیماتِ نبوی کا نور ساتھ نہیں ہوگا، محض کتاب پڑھنے اور سمجھنے سے قوتِ عملیہ حرکت میں نہیں آئیگی، جس طرح جب تک نورِ بصر کے ساتھ سورج یا چراغ کا نور نہیں ہوگا، نورِ بصر کام نہیں کرتا، اِسی طرح قوتِ عملیہ کے ساتھ جب تک نورِ نبوت نہیں ہوگا، اُس وقت تک اُس قوت کی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں ہوگا۔

صفاتِ ''صدق و تقویٰ'' کے حصول کے لئے بھی حق تعالیٰ شانہ نے انسانی فطرت کو ملحوظ رکھ کر صادقین یعنی ایسے لوگوں کی معیت و صحبت کا حکم دیا جو اپنے بڑوں سے تربیت پا کر اُن صفات کو اپنے اندر پیدا کرچکے ہیں، ایسا نہیں کہ تقویٰ و صدق کی ماہیت اور اقسام بتا کر کہہ دیا گیا ہو کہ یہ صفات تم سے مطلوب ہیں، تقویٰ یہ ہے، صدق یہ ہے، یہ صدق فی الجَنان ہے، یہ صدق فی اللسان ہے، افعال واحوال کا صدق یہ ہے، تم اپنی قوتِ عملیہ کے ذریعہ یہ صفات حاصل کرلو، بلکہ اِس کے لئے صادقین کی صحبت اٹھانے کو اور اُن سے تربیت پانے کو ضروری قرار دیا، کیونکہ قوتِ عملیہ اپنا جوہر اُسی وقت دکھا پائے گی جب اُس کی تربیت ہوجائے گی، اور اسکو اہلِ تقویٰ اور اہلِ صلاح

کی صحبت میسر آئے گی، اِس لئے حکم دیا گیا کہ تم صادقین کی معیت اختیار کرو، کیونکہ مشائخ وسلَفِ صالحین کے واسطے سے سینہ بسینہ اُن کو نورِ نبوت حاصل ہو چکا ہے، یہ صادقین ہیں، اہلِ صلاح اور اہل تقویٰ ہیں، اُنہوں نے اپنے اساتذہ سے سیکھ کر، اور اپنے مشائخ سے تربیت پاکر، اپنی قوتِ عملیہ کو فعّال بنا لیا ہے، اُسے منوّر کرلیا ہے، اِن حضرات کی صحبت وتربیت سے تمھاری قوتِ عملیہ بھی فعّال اور منوّر ہو جائیگی، اور اس کے نتیجہ میں یہ صفات بآسانی تمھیں حاصل ہو جائیں گی، اِسی نکتہ کی وجہ سے تقویٰ اور صدق حاصل کرنے کے لئے صادقین کی معیت کا حکم دیا گیا ہے۔

صفاتِ صدق کے حصول میں توبہ کی تاثیر:

قوتِ عملیہ کو فعّال اور متحرّک بنانے کے لئے صحبت اور تربیت ضروری ہے، قوتِ عملیہ کے دائرۂ کار میں اللہ کی رضا والے جو اعمال آتے ہیں، اُن میں سے توبہ کا عمل بڑا مُثمِر ثمرات، اور اللہ کی رضا کا موجِب ہے، توبہ میں بندہ اپنے خالق ومالک کے سامنے اپنی خطاولغزشوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اپنا عجز وانکسار ظاہر کرتا ہے، اِس لئے توبہ کے عمل سے حق تعالیٰ شانہ کو حد درجہ خوشی ہوتی ہے، اور توبہ کرنے والے کے لئے ترقی کی راہ ہموار ہو جاتی ہے، چنانچہ توبہ پر دوام اختیار کرکے ایک ادنیٰ مسلمان ترقی کرتے ہوئے صالحین وصادقین کے مرتبہ میں پہنچ سکتا ہے، اور معرفتِ خداوندی کے بلند مرتبے حاصل کرسکتا ہے اِس کی دلیل ہمیں قرآن کریم کی اس آیت میں ملتی ہے:

﴿وَتُوبُوا اِلَى اللهِ جَمِيعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (النور:۳۱)

اور اے مسلمانوں! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس آیتِ کریمہ میں بلا کسی استثناء کے تمام مؤمنین کو توبہ کا حکم دیا ہے، خواہ عام مؤمنین ہوں، یا اولیاء اللہ اور مشائخ ہوں، حتّٰی کہ انبیاء علیہم السلام بھی اِس حکم میں داخل ہیں، اُن کو بھی توبہ کا حکم دیا گیا ہے، اور توبہ کے عمل پر فلاح کا مژدہ سنایا گیا ہے، فلاح عربی زبان کا لفظ ہے، یہ لفظ بہت مختصر ہے، لیکن مفسرین نے فرمایا کہ یہ لفظ جتنا مختصر ہے اُتنا ہی جامع ہے، اِس کے معنی میں اِسی قدر وسعت ہے، چنانچہ فلاح کا مفہوم یہ ہے کہ ہر خیر بندہ کو حاصل ہو جائے اور ہر مکروہ سے حفاظت ہو جائے۔

اِس معنی کے لحاظ سے اعمالِ صالحہ کا اہتمام، معاصی واخلاقِ رذیلہ سے اجتناب، صدق واخلاص کا حصول، اور معرفتِ خداوندی کے بلند مراتب یہ سب فلاح کے مصداق میں داخل ہیں، اور آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں عجز وانکساری کرتے رہو، توبہ واستغفار کا اہتمام کرو، تو حق تعالٰی شانہ تمھیں اپنے پسندیدہ اعمال واخلاق کی توفیق بخشے گا، صدق ومعرفت کے وہ درجات اور وہ مراتب عطا فرمائے گا جو مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہونگے، بلکہ اُن مراتب میں ترقی ہوتی رہے گی، یہی در حقیقت فلاح وکامیابی ہے۔

توبہ کے ذریعہ ادنی مرتبہ سے لے کر اعلٰی مراتب تک کا حصول کیونکر ہوتا ہے؟ اِس کے لئے یہ سمجھنا ہوگا کہ توبہ کے معنی کیا ہیں؟ اور ہر شخص کے لئے توبہ ضروری کیوں ہے؟

ہر شخص کو ہر وقت توبہ کی ضرورت :

اِس سلسلے میں ہم امامِ غزالیؒ کا ایک جامع کلام نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

چونکہ کوئی بھی انسان کسی بھی وقت گناہ سے خالی نہیں ہے، اِس لئے کوئی وقت بھی ایسا نہ ہوگا جس میں کوئی شخص توبہ سے مستغنی ہو، کیونکہ انسان کسی حال اور کسی رتبہ کا بھی ہو، یہ ضروری ہے کہ یا تو اُس کے اعضاء میں سے کوئی عضو کسی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہوگا، اور یا قلب سے کوئی گناہ ثابت ہو رہا ہوگا۔

یعنی یا تو جوارح کسی خلافِ شرع حالت میں ملوث ہونگے، اور یا قلب کسی مذموم خصلت یا ایسی بدعات میں ضرور مبتلا ہوگا، جسکی اصلاح کے لئے توبہ کی حاجت ہوگی، اور اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ کوئی انسان فرشتہ سیرت اور ایسا مہذب بن گیا کہ اُس کی کوئی عادت اور کوئی خصلت بھی ایسی نہیں ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہو، تب بھی ایسا وقت تو ضرور ہوگا جس میں حق تعالیٰ کی یاد سے اُس کو غفلت ہوگی، اور چونکہ حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ جب پروردگار کو بھولو تو فوراً یاد کر لو، اِس لئے پھر بھی اُس حالت سے رجوع کرنے اور غفلت سے یاد کی طرف پلٹنے کی ضرورت ہوئی، اور اِس رجوع کا نام توبہ ہے۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے، کہ کوئی شخص خدا کی یاد میں ہر آن مستغرق اور محو ہے کہ کوئی لحظہ بھی قلب کو غفلت نہیں ہوتی، اگرچہ اِس درجہ استغراق دشوار بلکہ قریب ناممکن ہے، تاہم اگر ایسا مان بھی لیا جائے، تو ہم کہیں گے کہ انسان جس مقام اور جس مرتبہ میں ہے اُس سے عالی مرتبہ پر پہنچنے سے پہلے پہلے پھر بھی توبہ کا محتاج ہے، کیونکہ ہر مقام اور ہر مرتبہ اپنے سے عالی اور مافوق مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ناقص کہلاتا ہے، اور ناقص سے باہر نکلنا

اور عالی و کامل پر پہنچنا ہر شخص پر لازم ہے، پس جب تک بھی اس میں رہے گا، توچونکہ وہ درجہ بھی اپنے مافوق درجہ کے اعتبار سے ناقص ہے، اِس لئے جب تک اُس سے باہر نہ نکلے، اور اوپر نہ پہنچے، اُس وقت تک وہاں بھی توبہ کا حاجت مند ہوگا، اِسی طرح سلسلہ چلتا رہے گا، اور چونکہ مراتبِ قربِ خداوندی غیر متناہی ہیں، یعنی کوئی مرتبہ ایسا نہیں جس کے مافوق اور بالا، کوئی دوسرا مرتبہ نہ ہو۔

لہٰذا کوئی حالت بھی ایسی نہ نکلے گی جس میں انسان کو نسبتاً ناقص مرتبہ میں رہنے کی وجہ سے خطاوار و عاجز، اور عالی مرتبہ تک پہنچنے کے سبب، توبہ کا ضرورت مند نہ کہا جائے، یہی بات ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ اپنی معصوم و بے گناہ ذات کے لئے فرماتے ہیں:

”کہ میں رات دن میں ستر مرتبہ توبہ واستغفار کرتا ہوں“

ہاں یہ ضرور ہے کہ عام لوگوں کی توبہ ظاہری گناہوں سے ہوا کرتی ہے، اور صالحین کی توبہ باطنی گناہوں، اور مذموم اخلاق سے ہوا کرتی ہے، اور متقین کی توبہ شک وشبہات کے ابتلاء سے ہوتی ہے، اور محبین کی توبہ اُس غفلت سے ہوتی ہے، جس نے ذکرِ الٰہی کو کسی لحظہ میں بھلا دیا تھا، اور عارفین کی توبہ اُس مقام سے ہوتی ہے جس پر پہنچے ہوئے ہیں، مگر اُس کا مافوق دوسرا مرتبہ ہے، جس پر اُن کو پہنچنا چاہئے، اور چونکہ حق تعالیٰ کے قرب کے مراتب و مقامات غیر متناہی و بے شمار ہیں، اِس لئے عارفین کی توبہ کا منتہیٰ نہیں ہے، اور نہ اُس کے خاتمہ کا کوئی وقت معین ہے۔ (تبلیغِ دین ص ۲۲۷)

توبہ کے درجات:

امامِ غزالی کے اِس کلام سے معلوم ہوا، کہ توبہ کے معنی رجوع کے اور لوٹنے کے ہیں، اور مؤمنین کے درجات کے اعتبار سے توبہ کی اقسام متفاوت اور متعدد ہیں، وہ اقسام یہ ہیں:

اول توبۂ مؤمنین:

عام مؤمنین کی توبہ ظاہری گناہوں سے ہوتی ہے، کیونکہ توبہ کی ابتدا یہ ہے کہ قلب پر نورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں، اور دل کو اِس مضمون کی پوری گہرائی حاصل ہو جائے کہ گناہ سمِّ قاتل ہے، اور تباہ کر دینے والی شئ ہے، اور پھر خوف وندامت پیدا ہو کر گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خاص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اُس کو فوراً چھوڑ دے، اور آئندہ کے لئے اُس گناہ سے پرہیز کرنے کا پختہ قصد کرے اور جہاں تک ہو سکے گذشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے، اِس سے توبہ کا کمال حاصل ہو جائے گا۔

دوسرے توبۂ صالحین:

اُن کی توبہ باطنی گناہوں سے اور مذموم اخلاق سے ہوتی ہے، یہ اپنا ظاہر سنوار چکے ہیں، اب اُن کی توجہ باطن کی اصلاح پر مرکوز ہوتی ہے، یہ دعا کرتے ہیں کہ، یااللہ! ہمارے دل میں تکبر ہے، ہمیں معاف فرما، یااللہ! ہمارے دل میں حسد ہے، ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف فرما، ہمارے اندر بخل ہے، ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف فرما، یہ لوٹے ہیں اخلاقِ ذمیمہ سے اخلاقِ حسنہ کی طرف۔

تیسرے توبۂ متقین:

متقین کی توبہ شک وشبہات کے اِبتلاسے ہوتی ہے،مؤمنین کا یہ طبقہ بہت سی ایسی جائز چیزوں سے بھی پرہیز کرتا ہے، جن میں کچھ شبہ ہو کہ مبادا اُس شئ کا استعمال اللہ کی ناراضگی کا موجِب نہ ہو جائے۔

چوتھے توبۂ محبین:

اِن لوگوں نے اپنے ظاہر اور باطن دونوں کو سنوارلیاہے، اُن کے قلوب میں اللہ کی محبت اور اُس کے عشق کی چنگاری پیدا ہو گئی ہے، عشقِ الٰہی میں ترقی کرنے کے لئے یہ حضرات اپنا ہر وقت اللہ کی یاد میں گذارنا چاہتے ہیں، اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہیں،اگر کبھی غفلت ہو جاتی ہے، تو اُن کو تنبہ ہوتا ہے، اور اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں ،یااللہ !ہم تجھ سے معافی مانگتے ہیں ،توبہ کرتے ہیں، ہمیں معاف فرما، اتنا وقت ہمارا غفلت میں گذر گیا، حالانکہ یہ وقت تیری یاد میں گذرنا چاہئے تھا،تو یہ ہے غفلت سے تذکر کی طرف لوٹنا، یہ محبین کی توبہ ہے۔

پانچوے توبۂ عارفین وصادقین:

عارفین ہمہ وقت اللہ کی یاد میں مشغول رہتے ہیں، اُن کو بھی توبہ کرنا ہے ،وہ کیسے توبہ کریں گے ؟اُن کی تو یہ شان ہوتی ہے کہ اللہ روزبروز ان کے درجات کو بڑھاتا ہے، اُنھیں ترقی ملتی ہے، اُن کے درجات بلند ہوتے رہتے ہیں، تو ان کے لئے توبہ کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالٰی کے قرب کے مراتب ومقامات غیر متناہی ہیں، جب اُنھیں نیچے کے درجے سے اوپر کا درجہ ملتاہے تو پہلے درجہ کو وہ کوتاہی سمجھتے ہیں، کہ اب تک ہم کوتاہی میں تھے، ہم چھوٹے

درجے میں تھے، چھوٹے درجے میں رہنا ہماری کوتاہی کی بنا پر تھا، اب یہ بڑا درجہ اللہ نے عطا فرمایا، یااللہ! یہ کوتاہی جو ہم سے ہوئی ہمیں معاف فرما، اِس لئے عارفین وصادقین بھی اللہ سے توبہ کرتے ہیں۔

اِس کا حاصل یہ نکلا کہ آدمی طبقاتِ مؤمنین میں سے کسی بھی طبقہ اور کسی بھی درجہ کا ہو، ہر ایک کو توبہ کی ضرورت ہے، عام مؤمنین کو توبہ کرنا ہے گناہوں سے، صالحین کو توبہ کرنا ہے اخلاقِ ذمیمہ سے، متقین شبہات کی چیزوں سے توبہ کرتے ہیں، محبین غفلت میں گذرے ہوئے اوقات سے توبہ کرتے ہیں اور عارفین وصادقین توبہ کریں گے کم درجات میں رہنے پر اکتفاء کرنے سے۔ اِسی لئے اللہ جلّ شانہ نے بغیر استثنا کے ہر ایک کو توبہ کا حکم دیا:

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (النور:۳۱)

توبہ کامیابی کی کنجی کیوں؟

توبہ کی بنیاد عاجزی وفروتنی پر ہے اور آخرت کی کامیابی ایسے ہی لوگوں کے لئے قرار دی گئی ہے، چنانچہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (القصص:۸۳)

یعنی ہم نے آخرت کی کامیابی اُن لوگوں کے لئے بنائی ہے جو دنیا میں بڑائی اور فساد نہیں چاہتے۔

معلوم ہوا کہ بڑائی اللہ کو ناپسند ہے، جو لوگ اپنے لئے بڑائی کے خواہاں ہوتے ہیں، من جانب اللہ اُن کی مدد نہیں کی جاتی، اُن کو حق تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوتا، نہ اُن کو صفاتِ قبول حاصل ہوتی ہیں، اُس کے برعکس توبہ کی بنیاد عاجزی وفروتنی پر ہے، اِس لئے توبہ کرنے والوں کی اللہ کی طرف

سے مدد کی جاتی ہے، ظفر و کامیابی اُن کے قدم چومتی ہے، کامیابی والے اعمال اور صفات اُن کو عطا ہوتی ہیں، اِس لئے توبہ کامیابی کی کنجی ہے، گویا توبہ کا عمل فلاح و کامیابی کا ایک بار آور درخت ہے، جس سے فلاح والے اعمال واخلاق اور فلاح والی صفات کا پھل تائبین کو حاصل ہوتا ہے، بالخصوص صدق واخلاص جو اعمال واخلاق کی روح ہے وہ توبہ سے اور بارگاہِ ایزدی میں عجز وانکسار سے پیدا ہوتا ہے۔

توبہ کے معنی:

توبہ کے معنی جیسا کہ ماقبل میں ذکر کیا گیا رجوع کے اور لوٹنے کے ہیں، توبہ کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے، اور بندوں کی طرف بھی ہوتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء:۱٦)

بے شک اللہ توبہ کو بہت قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

﴿وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (النور:۳۱)

کہ تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو۔

اِن کے علاوہ اور بھی کئی آیات میں توبہ کی نسبت اللہ کی طرف اور بندوں کی طرف کی گئی ہے، لفظِ توبہ کی نسبت جب بندہ کی طرف ہوتی ہے، تو معنی ہوتے ہیں "غلطی سے طاعت کی طرف لوٹنا" اور جب حق تعالیٰ کی طرف نسبت ہوتی ہے، تو اُس وقت معنی ہوتے ہیں، "سزا سے رحمت اور مغفرت کی طرف لوٹنا"۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بندہ معصیت اور نافرمانی کی بنا پر سزا اور عقاب کا مستحق تھا، اُس کو سزا ملنی چاہئے تھی، جب بندہ نے توبہ

کی، اور بندہ اللہ کی نافرمانی سے طاعت و فرمانبرداری کی طرف لوٹا، تو حق تعالیٰ شانہ بھی سزا سے مغفرت کی طرف لوٹا، پھر بجائے سزا دینے کے اُس بندہ پر اللہ نے اپنی عنایت اور رحمت فرمادی۔

جب توبہ کے شرائط متحقق ہو جائیں، تو اللہ کے فضل سے گناہ کا معاف ہونا یقینی ہے۔

توبہ کے شرائط:

توبہ کی تین شرطیں ہیں، اول اپنی غلطی پر ندامت ہو، دوسرے توبہ کے وقت گناہ کو ترک کر دے، تیسرے آئندہ اُس گناہ کو نہ کرنے کا پختہ عہد کرے، اس سلسلے میں امامِ غزالی فرماتے ہیں:

توبہ کی جب یہ تمام شرائط پوری ہو جائیں گی تو اُس کی قبولیت میں شک نہ ہو گا، کیونکہ قبول ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے قلب میں انوارِ معرفت کی تجلیات کے قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے، اور ظاہر ہے کہ انسان کا قلب آئینہ کی مانند ہے، جس پر خواہشاتِ نفسانیہ اور حرص وہوا کے باعث غبار جم جاتا ہے، یا کسی گناہ کی وجہ سے سیاہی چھا جاتی ہے، مگر نیک کام جو بمنزلۂ نور کے ہیں، اپنی روشنی اور چمک دمک سے اُس تاریکی کو دور کر کے آئینۂ قلب کو صیقل کرتے رہتے ہیں، اِس لئے انسان جب کوئی برا کام کرے گا، اور نادم وپشیمان ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گا، تو ضرور ایسی حالت ہو گی جیسے کپڑے پر صابون لگانے سے ہوتی ہے، اگر صابون باقاعدہ لگایا گیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میل نہ اُترے، اِسی طرح اگر دل اخلاص وتوجہ کے ساتھ متوجہ ہوا ہے، تو ممکن نہیں کہ قلب میں صفائی وانشراح اور تجلیاتِ معرفت کی

استعداد و قابلیت نہ پیدا ہو۔ (تبلیغِ دین ص ۲۰۴)

استغفار کا مفہوم اور اس کی حقیقت :

اب تک توبہ کا بیان ہوا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر استغفار کا بھی کچھ بیان کر دیا جائے کیونکہ توبہ کے ساتھ استغفار کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔

استغفار کے معنی ''مغفرت چاہنا'' یعنی حق تعالیٰ شانہ سے مغفرت کی دعا اور التماس کرنا، پس استغفار کی حقیقت ''دعا'' ہے، بندہ اپنے لئے حق تعالیٰ شانہ سے مغفرت کی دعا اور درخواست کرتا ہے، لہٰذا توبہ اور استغفار میں فرق ہے، توبہ استغفار پر مشتمل ہوتی ہے یعنی جب بندہ اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے، اور توبہ کے شرائط جمع ہوتے ہیں، تو اِس میں اللہ سے معافی مانگنا پایا ہی جاتا ہے، اِس لئے توبہ استغفار کو متضمّن ہے۔

برخلاف استغفار کے، کہ اُس میں توبہ کا تحقق ضروری نہیں ہے، اگر استغفار کے ساتھ توبہ کے شرائط پائے جائیں تو استغفار کے ساتھ توبہ کا تحقق بھی ہو جائے گا، اور اگر استغفار ہو اور شرائطِ توبہ موجود نہ ہوں، تو یہ استغفار توبہ پر مشتمل نہ ہو گا۔

توبہ سے گناہ کی معافی اللہ کے فضل سے یقینی ہے، اور شرائطِ توبہ کے بغیر محض استغفار ایک دعا ہے، جس میں قبول و عدمِ قبول، دونوں کا احتمال ہے، پس جس طرح دعا نہایت مفید عمل ہے اسی طرح استغفار اگرچہ شرائطِ توبہ متحقق نہ ہوئے ہوں، نہایت مفید عمل ہے، یہ توبہ اور استغفار کا فرق ہے، اِسی لئے بہت سے محدثین جب توبہ و استغفار کا بیان کرتے ہیں، تو عنوان

میں استغفار کے ساتھ توبہ کا لفظ بھی لاتے ہیں، چنانچہ صاحبِ مشکوٰۃ نے مشکوٰۃ شریف میں عنوان یہ قائم کیا ہے: "باب الاستغفار والتوبة"۔

استغفار کے فوائد وثمرات:

چنانچہ استغفار فی نفسہ ایک مہتم بالشان دعا ہے، اور اُس کے فوائد وثمرات بہت ہیں، اول استغفار کے اہتمام سے عذابِ الٰہی سے حفاظت ہوتی ہے، اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (الانفال: ۳۲)

اور اللہ تعالیٰ اُن کو عذاب نہ دیں گے، جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔

دوسرے استغفار کی برکت سے خوشحالی نصیب ہوتی ہے، آسمانوں سے بارش برستی ہے، مال واولاد میں برکت ہوتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام کا قول، اللہ نے قرآنِ کریم میں نقل فرمایا:

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا . يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ﴾ (نوح: ۱۰-۱۱-۱۲)

اور میں نے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے گناہ بخشواؤ، بیشک وہ بڑا بخشنے والا ہے، کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا، اور تمھارے مال اور اولاد میں ترقی دے گا۔

حدیث شریف میں استغفار کے تین اہم فائدے بیان فرمائے گئے، حدیث یہ ہے:

«مَنْ لَزِمَ الْاِسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللّٰهُ لَهٗ مِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجًا ، وَمِنْ كُلِّ غَمٍّ مَخْرَجًا ، وَرَزَقَهٗ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ»

(مشکوٰۃ باب الاستغفار والتوبة فصلِ ثانی ص ۲۰۴ بحوالہ احمد وابوداؤد وابنِ ماجہ)

یعنی جو بندہ استغفار کو لازم پکڑ لیتا ہے، اپنی تقصیرات کا اعتراف کر کے اللہ سے معافی کا خواستگار رہتا ہے، اللہ تعالیٰ شانہ اُس کے لئے ہر مصیبت سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دیتا ہے، اور ہر غم سے نجات دیتا ہے، اور اللہ اُس کو ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتا ہے، جہاں سے روزی ملنے کا اُس کو گمان بھی نہ تھا۔

تینوں فوائد کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کی مدد اُس بندہ کے شاملِ حال ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اُس کے دنیا کے کام بھی بناتا ہے ،وہ قدم قدم پر نصرتِ خداوندی کا مشاہدہ کرتا ہے،اور اُمورِ آخرت بھی اُس کے لئے سہل اور آسان ہو جاتے ہیں ،وہ بندہ آخرت کی کامیابی سے بھی ہمکنار ہوتا ہے، اِسی لئے اولیاء اللہ اور مشائخ کا استغفار کا باقاعدہ وظیفہ ہوتا ہے، اُن کے وظائف میں استغفار نہایت اہم وظیفہ شمار ہوتا ہے۔

استغفار شب بیداروں کا وظیفہ:

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں متقین کے لئے جنت کی اور اُس کی نعمتوں کی بشارت سنائی ہے، اُن کو جنت کا داخلہ کن اعمال سے نصیب ہوا؟ وہاں کے باغ و بہار کے وہ کیوں مستحق ہوئے؟ اُس کے اسباب کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ﴾ (ذاریات:۱۶)

کہ اُن کے اعمال واحوال میں اخلاص ہوتا تھا،وہ جو کچھ کرتے ،اللہ کی رضاوخوشنودی کے لئے کرتے تھے۔

﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ (ذاریات:۱۷)

وہ راتوں کو کم سوتے تھے،عبادت اور بندگی اُن کا شیوہ تھا،رات کی

تنہائیوں میں اپنے مالک کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے، قیام کرتے، رکوع کرتے، اور طویل سجدوں سے اُس کی خوشنودی کا لطف حاصل کرتے، جب سحر کا وقت ہو جاتا، اور صبح قریب ہو جاتی، تو حق تعالیٰ شانہ کے سامنے روتے، اور توبہ واستغفار کرتے۔

﴿وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾ (ذاریات:۱۸)

کیونکہ یہ بندے اہلِ معرفت ہیں، یہ جانتے ہیں کہ ہم سے اُس خالقِ جل وعلیٰ کی شایان شان عبادت کہاں ہو سکتی ہے، اور ہم کیونکر حقِ عبادت ادا کر سکتے ہیں، ہم ناقص ہیں، ہماری عبادت بھی ناقص ہے، اپنی اِس تقصیر وکوتاہی پر استغفار کرتے ہیں۔

حقیقت یہی ہے کہ بندہ تمام زندگی بندگی میں لگا رہے پھر بھی حقِ بندگی ادا نہیں ہو سکتا، اِس لئے ہمیشہ اپنے آپ کو اور اپنے اعمال کو ناقص سمجھتا رہے، ہمیشہ اپنے آپ کو ناقص سمجھتے رہنا ہی بندگی کا کمال ہے۔

خلاصۂ کلام:

اِبتدا کی چار مجلسوں میں صدق اوراقسامِ صدق کی تفصیل بتائی گئی، پانچویں مجلس کا حاصل یہ ہے، کہ اِن صفات کا حصول، عجز وانکساری اور توبہ واستغفار سے ہو گا، توبہ واستغفار سے اپنے محاسبہ کی فکر پیدا ہوتی ہے، توبہ گویا ایک آئینہ ہے، جس سے اپنے اندر پائی جانے والی کوتاہیاں نظر آنے لگتی ہیں، پھر آدمی کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اُس سے کیا غلطی ہو رہی ہے، اور اُس کا تدارک کس طرح ہو سکتا ہے، اِسی لئے توبہ کے عمل پر فلاح وکامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے۔

توبہ کے عمل کی توفیق کس طرح ہو گی؟اور انسان کی قوتِ عملیہ کی صلاحیت کب اُجاگر ہو گی؟اِس کے لئے علماء وصلحاء وصادقین کی صحبت اختیار کی جائے، تاکہ نیک مجلسوں سے اُس قوت کو سہارا ملے، کیونکہ انسان کے اندر ودیعت شدہ قوتوں کو، اگر موافق ماحول ملے، اور اُس موافق ماحول سے اُن کو تقویت ملے، تبھی وہ قوتیں اپنا عملی جوہر دکھا پاتی ہیں، صادقین کی معیت کا اور اُن کے ساتھ نشست وبرخاست کا حکم اِسی لئے دیا گیا، اُن کو اللہ کی صفات کی معرفت حاصل ہے، اُن کے قلب میں اللہ کا خوف ہے، خشیت ہے، وہ جانتے ہیں کہ غلطی کہاں کہاں سے ہوتی ہے،وہ صدق کی حقیقت کو بھی جانتے ہیں، عام لوگ تو صدق کو زبان کی سچائی تک محدود خیال کرتے ہیں، لیکن جو اہلِ علم اور اہلِ صدق ہیں، اُنھیں معلوم ہے کہ کیا کیا صورتیں غلطی کی ہیں، دل سے بھی خطا ہوتی ہے، دل کا بھی کذب ہوتا ہے،زبان کا بھی کذب ہوتا ہے، اعمال اور احوال میں بھی کذب شامل ہو جاتا ہے، یہ حضرات اصلاح کے اُن مراحل سے گذر چکے ہیں، اپنے مشائخ سے اپنی اصلاح کرا چکے ہیں، تم اُن کی معیت اور اُن کی صحبت اختیار کروگے، اُن سے تعلق اور محبت رکھوگے ،تو تم بھی اُن کے رنگ میں رنگ جاؤگے، اُن کی برکت سے تمھارے اندر بھی یہ صفات آجائیں گی، کیونکہ صحبت کی تاثیر لازم ہے، کسی نے کہا ہے:

صحبت صالح ترا صالح کند ٭ ٭ صحبت طالح ترا طالح کند

کہ نیک کی صحبت تجھے نیک بنادے گی، اور بد کی صحبت تجھے بد بنادے گی۔

انسان تو صحبت کا اثر قبول کرتا ہی ہے، کہ وہ ذی عقل وذی شعور ہے، جمادات ونباتات بھی صحبت کے اثر سے متأثر ہوتے ہیں، شیخ سعدی علیہ الرحمہ نے اِس کی بہترین تمثیل بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

گِلے خوشبوئے در حمام روزے ** رسید از دستِ محبوبے بدستم

یعنی ایک دن حمام (غسل خانہ) میں مجھے ایک خوشبودار مٹی (صابن کی ٹکیہ) نظر آئی، جو ایک دوست کے ذریعہ میرے پاس پہنچی۔

بگفتم مشکی یا عبیری ** کہ از بوئے دل آویز تو مستم

میں نے اُس سے کہا کہ تو اپنی حقیقت بیان کر، تو مشک ہے یا عنبر، کیونکہ تیری دل کو لبھانے والی خوشبو سے میرے اوپر ایک مستی طاری ہوگئی ہے۔

بگفتا من گلے ناچیز بودم ** ولیکن مدتے باگل نشستم

جمالِ ہم نشیں درمن اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اُس نے کہا کہ میری حقیقت یہ ہے کہ میں ناچیز مٹی تھی، لیکن ایک عرصہ تک مجھے پھول کی ہم نشینی حاصل ہوئی، اُس پھول نے میرے اندر اثر کیا، ایک عرصہ تک اُس کے ساتھ رہنے سے میرے اندر بھی خوشبو پیدا ہوگئی، ورنہ میں تو وہی بے حقیقت مٹی تھی، جس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

قدیم زمانہ میں جب صابون بنایا جاتا تھا، تو مٹی کو پھولوں میں بسا کر رکھ دیا جاتا تھا، ایک مدت تک اُس کو اِسی طرح رکھا جاتا، جس سے پھولوں کی خوشبو مٹی میں سرایت کر جاتی، پھر وہ مٹی خوشبو والی ہو جاتی، اور اس سے صابون تیار ہوتا۔

اِس لئے اِس تمثیل میں مٹی نے پھولوں کی ہم نشینی کا، اور ان کی معیت سے اپنے اندر خوشبو پیدا ہونے کا ذکر کیا۔

کہنے کو یہ ایک تمثیل ہے، لیکن بات بالکل برحق ہے، کہ نیک صحبت کا اثر ہوتا ہے، صالحین وصادقین کی صحبت سے آدمی اُن کے رنگ میں رنگ جاتا ہے، اور صدق وصلاح کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ ہمارے اندر اصلاح کی طلب پیدا فرمائے، اور اپنے برگزیدہ بندوں کی محبت اور اُن کی صحبت ومعیت میسر فرمائے، مکمل صدق واخلاص عطا فرمائے۔

اٰمِیْنَ ، بِجَاہِ سَیِّدِ الْاَبْرَارِ وَالْمُرْسَلِیْنَ ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِینَ ، وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ